صحف مطہرة فیہا کتب قیمة

مقالاتِ شبلی

(تعلیمی)

جلد سوم

مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

کے

تمام تعلیمی مضامین کا مجموعہ جن کو مختلف رسالوں سے جمع کیا گیا ہے۔

دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یو۔ پی (الہند)

فہرست مضامین

مقالاتِ شبلی جلد سوم (تعلیمی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم

"مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" میرے مضمون کا عنوان ہے، یہ ایک ایسا وسیع مضمون ہے کہ اگر اس کے ذیل میں مسلمانوں کے تمام علمی کارنامے بیان کیے جائیں تو شاید ناموزوں نہ ہو لیکن میں نے اپنے مضمون کے لیے ان میں سے صرف دو بحثیں انتخاب کی ہیں (۱) مسلمانوں نے علوم و فنون کس طرح حاصل کیے۔ (۲) دنیا کی تمام قوموں کو ان علوم کی کیونکر تعلیم دی۔ عالی حوصلگی کے خاص لفظ سے تو اس مضمون کا اصلی عنوان ہے: یہی دو بحثیں قریبی تعلق رکھتی ہیں۔

مسلمانوں نے جن علوم کی اشاعت کی ان میں سے بعض ان کے ذاتی علوم ہیں جو خود انھوں نے ایجاد کیے یا ان کو ترتیب دیا، اور بعض ایسے ہیں جو دوسری قوموں سے حاصل کیے اور پھر ان کو ترقی دی کہ گویا انھیں کے ایجادات سے ہیں۔ میرے مضمون کو ان دونوں قسم کے علوم سے تعلق رکھتا ہے لیکن علوم کی ذاتی حیثیت سے نہیں بلکہ ان کی طرز تعلیم کے اعتبار سے۔

میں افسوس کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ ان دو بحثوں کی

تفصیل کے لیے جس قسم کے ضروری حالات درکار ہیں، جن فلسفہ یونانی وغیرہ کے
ترجمے، مترجموں اور تصنیفات کے نام، اسماء الرجال اور مدرسوں کی تفصیل، طریقہ
درس و نصاب تعلیم، غرض اس قسم کے حالات مجھ کو کسی مستقل تصنیف میں نہیں ملے اور
شاید لکھے بھی نہیں گئے۔ کشف الظنون (۱) جیسی بڑی فہرست میں صرف ایک کتاب کا
نام ملتا ہے لیکن غالباً خود کشف الظنون کے مصنف کو بھی اس کا دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔
چند اجمالی حالات جو گبن کی رومن امپائر، ہسٹری آف فلاسفی مصنفہ ہنری لوئیس،
تمدن اسلام، لیکی، چیمبرز انسائکلوپیڈیا یا برٹینیکا انسائکلوپیڈیا وغیرہ میں ملتے ہیں، وہ اس
غرض کے لیے بے کار ہیں۔ یہ ہے کہ جب مسلمانوں کی علمی ترقی کے عام تذکرہ میں کسی
پرجوش خطیب کی زبان سے ادا ہوں تو مسلمانوں کو بھا دیں لیکن ان سے ایک مفصل
تاریخی تذکرہ کیوں کر مرتب ہو سکتا ہے۔ میں نے مختلف تاریخوں اور دوسری قسم کی
تصنیفوں کے جستہ جستہ مقامات سے کچھ حالات بہم پہنچائے ہیں اور غالباً یہ پہلی تحریر
ہے جس میں اس قدر واقعات جمع کیے گئے ہیں۔ اصل مضمون شروع کرنے سے پہلے
میں ایک اجمالی طریقے پر مسلمانوں کے عقلی علوم، ان کی ابتدائی تاریخ اور سبب
ایجاد کا تذکرہ کرنا مناسب خیال کرتا ہوں۔

اسلام سے پہلے عرب کی قوم عقلی علوم و فنون سے بالکل بے بہرہ تھی۔
تاہم ان خانہ بدوش صحرائیوں میں علمی مذاق کی جو ہیولانی حالت تھی، نظم و نثر ان کا مایۂ خمیر
تھا لیکن وہ عوام و بلیغ کی طرح محض تخیل الصحیح اللسان نہ تھے بلکہ فصاحت و بلاغت
کے دقیق نکتوں تک ان کی نگاہ پہنچتی تھی۔ بازار عکاظ کے پرجوش مشاعرے اور ان کے
باہمی مباحثے اور نکتہ چینیاں بتاتی ہیں کہ جو کچھ وہ کہتے تھے جانتے تھے کیا کہتے ہیں
اور کیا کہنا چاہیے۔ امرؤ القیس اور علقمۃ الفحل کی شاعرانہ نزاع کا ایک عام عورت سے

(۱) یہ ایک نہایت ضخیم کتاب کی چند جلدوں میں ہے جس میں قریباً پندرہ ہزار اسلامی تصنیفوں کے
نام اور ان کے حالات ہیں۔ یہ ضخیم جلدوں میں بمقام لندن ۱۸۵۸ء میں چھاپی گئی ہے۔

جس خوبی سے فیصلہ کیا آج فن انشا کے بڑے ماہر بھی اس سے عمدہ رپورٹ نہیں
کر سکتے، اس کے سوا نسب کے فخر اور رشتہ و قرابت کی پابندیوں کی وجہ سے کل عرب
اگلے کارناموں کو ایک مسلسل ترتیب کے ساتھ محفوظ رکھتے تھے۔

اسلام نے آ کر مذہب و معاشرت کے ساتھ ادب کی بھی زندگی بالکل
بدل دی، قرآن مجید کی پر تاثیر آیتوں نے شعراء و خطیبوں کی زبانیں بند کر دیں اور چونکہ
دولت دنیا بھی خاندان مضر کی تھی، تمام عرب کی دماغی قوتوں کا رخ اسلام کی طرف پھیر دیا
تھا، پچھلے قصے تھوڑے دنوں کے لیے بھلا دیئے گئے اور علم الانساب والایام العرب کا
زور بھی گھٹ گیا، لیکن اسلام نے جس قدر چھینا اس سے بہت زیادہ عطا کیا، قرآن کی
برابری کرنے کے حوصلے بہت جلد پست ہو گئے، اب شعر اور خطیبوں کے لیے قرآن
خود رہنما بنا اور فصاحت و بلاغت کے متعلق بہت سے نئے اصول کھول دیئے، زبان
نہایت شستہ اور صاف ہو گئی اور اونٹ بکری کے قصوں کے علاوہ شعراء کو اخلاق اور
شریعت کے بہت سے مضامین ہاتھ آ گئے، یہی وجہ ہے کہ حسان، حطیہ، ذوالرمہ، جریر،
فرزدق، اخطل کے کلام میں جو لطافت اور پختگی ہے شعرائے جاہلیت کے رجز
و قصائد میں اس کا سراغ بھی نہیں ملتا۔ (۱)

تمام مذہبی علوم گویا اسلام کے ساتھ پیدا ہوئے، ہر چند بعد میں گو وہ کس
حد تک پہنچ گئے ہوں لیکن سچ پوچھیے تو ان کے ابتدائی اصول تمام تر قرآن مجید سے ماخوذ
ہیں، اس کے اوامر و نواہی نے فقہ کی طرف رہبری کی، آیت توریث نے فرائض کا ایک
مستقل فن قائم کیا، انبیائے سابقین کے حالات سے قصص کی ترتیب ہوئی، اعتقادات
اور معاد کے متعلق آیتوں سے علم کلام استنباط کیا گیا اور گو ایک مدت تک کسی قسم کی تدوین
و ترتیب نہیں ہوئی لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی ان علوم کی ابتدائی
بنیاد قائم ہوئی اور دوسری صدی کے آغاز تک ہزاروں مسائل کا دفتر مدون ہو چکا تھا۔

(۱) دیکھو تاریخ ابن خلدون کا مقدمہ صفحہ ۲۰۹ از فصل ۱۳-۲

قرآن مجید میں فرائض اور اعمال کا بیان اجمالی ہے، تفصیلی طریق عمل کی تصریحیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق عمل پر منحصر تھیں۔ اس ضرورت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کے متعلق روایتوں کے جمع کرنے کی طرف خیال مائل ہوا اور رفتہ رفتہ فن حدیث و اسماء الرجال و علم انساب پیدا ہو گئے۔ ان تحقیقات میں گو کسی قدر نکتہ چینی کی جائے مگر کوئی منصف یہ فیصلہ کرے گا کہ جس بے انتہا کوشش اور تحقیق سے مسلمانوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال محفوظ رکھے دنیا کی کسی قوم میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی اور یہ انسانی کوشش اور جستجو کی آخری سرحد ہے جہاں تک مسلمان پہنچ گئے تھے۔

علم نحو اگرچہ کوئی مذہبی فن نہ تھا لیکن مذہبی ضرورت سے اس کی تدوین کی طرف خیال مائل ہوا۔ اسلام دور دراز ملکوں میں پھیل گیا تھا اور ان ملکوں کی قومیں اس میں شامل ہوتی جاتی تھیں، دوسری زبانوں کے الفاظ عربی زبان میں بہت جلد جگہ پا گئے تھے جس سے احتمال تھا کہ مشتقات اور اصول اعراب میں بھی فرق آ جائے۔ اس قسم کے تصرفات سے جو صدمہ زبان پر پڑتا اس کا اثر قرآن اور حدیث پر ہوتا۔ چند واقعات نے اس احتمال کو قوی کر دیا اور بالآخر ابوالاسود دؤلی المتوفی ۶۹ھ جس نے خود اس قسم کے تجربے حاصل کیے تھے، مسائل نحوی کی تدوین کی طرف مائل ہوا۔ اس نے چند قاعدے منضبط کیے جو رفتہ رفتہ وسعت حاصل کرتے گئے۔ ہارون رشید کے زمانہ میں خلیل بن احمد بصری المتوفی ۱۷۰ھ اور سیبویہ و کسائی وغیرہ کی توجہ سے وہ ایک مستقل فن بن گیا جس کو متاخرین نے بھی بہت کچھ ترقی دی۔

غرض مذہب کے متعلق جس قدر ضروری امور بہ اشتمال عموم تھے وہ مذہب کے ساتھ پیدا ہوئے اور تھوڑے دنوں کے لیکن یا عام مجلسوں میں ان کے مستقل رواج پا گئے۔ خود صحابہ کے عہد میں ایسے متعدد اشخاص(۱) موجود تھے جو کثرت معلومات کے

---

(۱) ابن حزم نے ان کی تعداد [illegible] تک خیال کی ہے۔ دیکھو فتح المغیث مطبوعہ لکھنؤ صفحہ [illegible]

سے کام نہیں لیا گیا مگر جس قدر زمانہ کو امتداد ہوتا جاتا تھا ان روایتوں کے دفتر تیار ہوتے جاتے تھے جن کو زبانی محفوظ رکھنا انسانی قوت کا کام نہ تھا، غرض ۱۴۳ھ میں تالیف و تدوین کا سلسلہ شروع ہوگیا، ابن جریج نے مکہ میں، امام مالک نے مدینہ میں، اوزاعی نے شام میں، ابن ابی عروبہ و حماد نے بصرہ میں، معمر نے یمن میں، سفیان ثوری نے کوفہ میں حدیث اور تفسیر کی کتابیں لکھیں، امام ابوحنیفہ نے دلائل کے ساتھ فقہ کو ترتیب دیا، ابن اسحاق نے مغازی و سیر کی تدوین کی (۱) یہاں تک کہ جب فضل بن یحییٰ برمکی کے اہتمام اور توجہ سے کاغذ بنانے کا کارخانہ جاری ہوگیا (۲) تو یہ علوم و فنون اس قدر پھیلے اور جس کثرت کے ساتھ مذہبی تصنیفیں ہوئیں اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف تفسیر کے متعلق سو سے زیادہ ایسے مصنف پیدا ہوئے جن کو [illegible] کا لقب دیا گیا اور ہر ایک نے متعدد اور اکثر نے سیکڑوں بلکہ ہزاروں کتابیں لکھی ہیں۔ (۳)

اسی زمانہ میں اور علوم بھی مذہبی ضرورت سے ایجاد ہوئے، علم البیان و کلام۔ اسلام کا جو بڑا معجزہ اور جو ہمیشہ استعمال کیا جا سکتا ہے قرآن تھا، اس کے معجزہ ہونے کا دعویٰ جب اہل عرب کے سامنے پیش کیا جاتا تھا تو کسی دلیل لانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، کفار عرب گو انکار پر تلے بیٹھے تھے مگر ان کا مذاق زبان دانی اس دعویٰ کے تسلیم کرنے پر ان کو مجبور کرتا تھا، وہ منہ سے انکار کرتے تھے مگر قرآن پڑھے جانے کے وقت ان کی بے اختیار حالت، بے ضبطی، بے تابانہ تاثر ان کے انکار کے خلاف شہادت دیتے تھے لیکن اسلام کا یہ دعویٰ صرف عرب کے سامنے چل سکتا تھا، اہل عجم نہ تو زبان عربی سے واقف اور واقف بھی ہوں تو عرب کا سا قدرتی ذوق کہاں سے لاتے، اس لیے ضرورت پڑی کہ فصاحت اور بلاغت کے اصول مرتب کیے جائیں تاکہ دوسری قومیں اگر مذاق سے نہیں تو علمی طور پر اس دعویٰ کے تسلیم کرنے پر مجبور ہوں

(۱) تاریخ الخلفاء سیوطی، خلافت منصور، وقائع ۱۴۳ھ (۲) مقدمہ ابن خلدون، فصل ۳۱ از فصل ۲

(۳) اتقان فی علوم القرآن میں مفسرین اور ان کے متعلق تصنیفات کا تذکرہ دیا گیا ہے۔

اول اول جعفر برمکی وزیر ہارون الرشید اور جاحظ نے چند قاعدے لکھے (۱) پھر متاخرین نے کلام کے ہر ایک حصہ کے متعلق مسائل استنباط کیے اور علامہ سکاکی کی مفتاح پر اس فن کا خاتمہ ہو گیا۔ علم البیان یونانیوں کے ہاں بھی تھا لیکن ہم کو معلوم ہے کہ ان کے خیالات سے مسلمانوں کو بہت کم آگہی ہوئی بلکہ بالکل نہیں ہوئی۔ تاہم ہم یقین کرتے ہیں کہ اگر یونانی زندہ ہوتے تو ہمارے علما کی دقت نظر اور قوت استنباط کی داد دیتے۔
علم کلام (۲) اس وقت پیدا ہوا جب یونانی علوم کے شائع ہونے سے مذہب اسلام فلسفہ سے ٹکرا گیا اور عام ظاہر بین آنکھیں مذہبی اعتقادات کو بے پروائی کی نگاہ سے دیکھنے لگیں۔ لیکن محققین اسلام کو پورا بھروسا تھا کہ "حق کو کوئی چیز صدمہ نہیں پہنچا سکتی" انھوں نے غلط خیالات اور انسانی رایوں کو جو مذہب میں داخل ہو گئی تھیں چھانٹ کر الگ کر دیا اور پرزور منطقی دلائل سے یہ بات ثابت کی کہ فلسفہ یونانی جس قدر کہ اسلام کے اصلی مسائل سے مختلف ہے خود غلط اور باطل ہے۔ امام غزالی کی تہافۃ الفلاسفہ اس فن میں پہلی تصنیف ہے جس کا تتبع امام رازی وغیرہ نے کیا اور اس ترقی کو پہنچایا کہ تہافۃ تقویم پارینہ کے برابر ہو گئی۔

اسلام اگرچہ فلسفہ سکھانے نہیں آیا تھا تاہم ذات باری کے متعلق اس نے جو کچھ بتایا وہ فلسفہ کے بڑے حصے یعنی الہیات کی جان ہے۔ گبن صاحب لکھتے ہیں۔

> "محمد کا مذہب شبہ اور ابہام سے آزاد ہے اور قرآن وحدانیت کا عمدہ ثبوت ہے۔ خدائے تعالیٰ کے باب میں آپ کا عقلی جوش مذہبی یہ تسلیم کرتا ہے کہ قابل عبادت ایک ذات غیر محدود اور قدیم بدون کسی صورت اور مکان اور بدون اولاد و مشابہت کے ہے جو ہمارے نہایت پوشیدہ خیالات میں حاضر ہے اور خود اپنی قوت کی ضرورت سے موجود ہے۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے مذہب میں تجسیم

---

(۱) مقدمہ ابن خلدون ذکر علم بیان   (۲) یہاں علم کلام کے علاوہ جس کا ذکر اوپر ہو چکا۔

موجودہ شریک یہ حق ہے اور یہ دین زمانہ حال کے ادراکات سے
شاید بہت عالی ہے کیونکہ جب ہم ماہیت تجربوں سے تمام
زیادات زمانی و مکانی دور کرتے ہیں تو باوجود اس کے جل و علا خداوند تعالیٰ ہی تو
کون چیز تصور اور فہم کے لیے باقی رہ جاتی ہے۔"

مسلمانوں کے مذہبی علوم کا یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے۔ ان کے سوا مسلمانوں نے جن علوم و فنون پر کتابیں لکھیں ان کی تعداد تقریباً دو سو ہے۔ کشف الظنون اور مدینۃ العلوم میں ان کا بیان مع تصنیفات کی تفصیل کے مل سکتا ہے مگر مجھ کو یہ دکھانا چاہیے کہ میرے مضمون کا عنوان "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" ہے نہ "گذشتہ علوم"۔ مذہبی علوم جس طرح سے تعلیم دیے جاتے تھے ان کا تفصیلی بیان آگے آئے گا۔ مسلمانوں نے جو کچھ دوسری قوموں سے سیکھا وہ منطق، الٰہی (۱)، ہندسہ، طبیعی، ہیئت تھے۔ حساب و طب میں بھی انہوں نے زیادہ تر دوسری قوموں کی شاگردی کی۔ اس بات کی بہت کم مثالیں ہیں کہ مسلمان عالموں نے خود یونانی و سریانی زبانوں کی تحصیل کی ہو اور اصلی کتابوں سے یہ علوم سیکھے ہوں۔ بے شبہ خلفا کے درباروں میں مترجموں کا ایک گروہ موجود تھا مگر جیسا کہ لوئیس صاحب کے چھیڑے ہوئے اعتراض کا کچھ جواب نہیں ہے کہ ان میں اکثر عیسائی تھے "حنین، حبیش، متی، یوحنا، اسحاق، یعقوب کندی وغیرہ جو بہت بڑے مترجم مشہور ہیں سب عیسائی تھے۔ حکمائے اسلام میں صرف فارابی ایک ایسا شخص ہے جو ان زبانوں کا پورا ماہر تھا اور اس نے خود ایک عیسائی عالم یوحنا بن حیلان سے یہ علوم اور [illegible] سیکھی تھیں۔ ارسطو کی کتابوں کی شرح اور توضیح میں بو علی سینا اور ابن رشد بہت زیادہ نامور ہیں اور یورپ نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے تاہم مجھ کو شبہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک کو بھی یونانی یا سریانی زبان آتی ہو۔

---

(۱) یہاں فلسفیوں کی الٰہی مراد ہے۔ ورنہ مسلمانوں نے الٰہی کے مسائل خود قرآن مجید سے حاصل کیے تھے۔

حوصلۂ شاہانہ سے توجہ کی، قیصرِ روم کو خط لکھ کر فلسفہ کی کتابیں منگوائیں اور چونکہ اس وقت تک دارالخلافہ میں ان زبانوں کے جاننے والے موجود نہ تھے یہ بھی فرمائش کی کہ جو کتابیں آئیں وہیں سے عربی میں ترجمہ ہو کر آئیں، چنانچہ اقلیدس اور کچھ طبعیات کی کتابیں مع ترجمہ کے بغداد پہنچیں۔ علمائے اسلام ان کو پڑھ کر اور بھی مشتاق ہوئے (۱) منصور کا شوقِ علمی دیکھ کر دور دور سے مترجمین اور علماء اس کے دربار میں آنا شروع ہوئے۔ مترجموں میں فرات بن شحناثا، حنین، بطریق (یہ سب عیسائی عالم تھے) نوبخت مجوسی، ابو سہل (مجوسی تھے) ابن المقفع اس کے دربار کے مشہور مترجم اور حکیم تھے (۲)، بطریق نے یونانی اور ابن المقفع نے فارسی زبان سے ترجمے کیے، ۱۵۲ھ میں ہندوستان کا ایک بڑا ریاضی داں ہندو علم منصوری پایۂ تخت کا شہرہ سن کر دارالخلافہ میں داخل ہوا، اس نے ایک نہایت عمدہ زیچ جس کو اس نے ایک عمدہ اور جامع تصنیف سے جو ایک بادشاہ ہندوستان مسمیٰ بہ ٹکر کی طرف منسوب ہے خلاصہ کیا تھا، منصور کی خدمت میں پیش کی، محمد بن ابراہیم فزاری نے منصور کے حکم سے عربی زبان میں اس کا ترجمہ کیا اور اس سے ایک کتاب مرتب کی جو ریاضی دانوں میں "سند ہند" کے نام سے مشہور ہے، مامون الرشید کے زمانے تک اول لوگ اسی زیچ پر اعتبار کیا جاتا تھا۔ (۳)

---

(۱) مقدمہ ابن خلدون ص ۴۸۱ مطبوعہ بیروت (۲) دیکھو مختصر الدول حالات خلفائے عہد منصور یہ ایک مختصر اور مفید تاریخ ہے، جو ابوالفرج ملطی ایک عیسائی عالم کی تصنیف ہے اور عربی زبان میں ہے، ڈاکٹر پوکاک پروفیسر آکسفورڈ کالج نے لیٹن میں اس کا ترجمہ کیا ہے، جس کتاب مع ترجمہ کے ۱۶۶۳ء میں بمقام لندن چھاپی گئی ہے، جہاں کہیں اس آرٹیکل میں مختصر الدول کا نام آئے اس سے یہی تاریخ مراد ہے، ابن البطریق و ابن المقفع کے لیے دیکھو کشف الظنون حرف حا وکر حکمت (۳) یہ تفصیل مع حالاتِ نادرہ جامع القصص الہندیہ میں ہے جو ہندوستان کے حالات میں چند رسالوں کا ایک مجموعہ ہے اور فرانس میں بمقام پیرس ۱۸۲۸ء میں چھپا ہے۔

منصور کے نامور فرزند مہدی نے اگرچہ اس طرف کچھ توجہ نہیں کی بلکہ ایک محکمہ تحقیقات زنادقہ قائم کر کے آزادیٔ رائے کو بالکل روک دیا لیکن خاندان برامکہ نے جو اس کے عہد میں سلطنت کا ایک بڑا رکن تھا، اس باب میں بڑی ناموری حاصل کی۔ ان کے اہتمام سے یونانی اور فارسی کی بہت سی کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ ابن ناعمہ، سلام ابرش (۱)، عبداللہ اہوازی ان کے عہد کے نامور مترجم تھے۔ ہارون الرشید نے جس کے نام سے یورپ و ایشیا دونوں واقف ہیں، پچھلی کوششوں میں اور بہت کچھ اضافہ کر دیا۔ اس نے ترجمہ اور تصنیفات کا ایک بڑا محکمہ قائم کیا، جس میں ہر زبان کے بڑے بڑے ماہر تصنیف اور ترجمہ کے کام پر مامور تھے (۲)۔ یوحنا ابن ماسویہ ایک عیسائی عالم جس کی مادری زبان سریانی تھی، قدیم یونانی طب کی تصنیفات کے ترجمے کے لیے انتخاب کیا گیا۔ اس محکمہ سے جس کو بیت الحکمۃ کہتے تھے، ژند، یونانی، فارسی، سنسکرت زبانوں کے ترجمے ہمیشہ تیار ہوتے تھے اور اشاعت پاتے تھے۔ منکہ اور صالح دو ہندو حکیم اس کے دربار میں تھے جو ترجموں کے علاوہ صاحب تصنیف بھی تھے۔ شاناق ہندی کی کتاب السموم منکہ ہی نے فارسی میں ترجمہ کرائی تھی۔ چرک اور سشرت کی تصنیفات طبی جو عربی میں ترجمہ ہوئیں غالباً اسی عہد میں اور انہیں ہندو حکیموں کے اہتمام میں ہوئیں۔ (۳)

---

(۱) ابن ناعمہ اور سلام ابرش کا ذکر بحیثیت مترجمین برامکہ صاحب کشف الظنون نے حکمہ کے ذکر میں کیا ہے۔ آگے فہرست میں چند کتابوں کے نام ملیں گے جو برامکہ کے لیے ترجمہ کی گئیں۔

(۲) ان ترجموں کا ذکر پامر صاحب کی تاریخ ہارون الرشید ص ۲۲۳ و چیمبرس انسائکلوپیڈیا جلد اول مطبوعہ لندن ۱۸۸۷ء ص ۳۴۷ اور کشف الظنون میں صراحۃً اور ضمناً ملے گا۔ (۳) الفنسٹن صاحب نے تاریخ ہندوستان حصہ مسلمانان میں لکھا ہے کہ منکہ و صالح دو ہندی طبیب ہارون الرشید کے دربار میں تھے۔ الفنسٹن صاحب نے صالح کو سالی پڑھا ہے اور کنکا لکھا گیا ہے۔ شاناق کا اصل نام شاید سنکو ہو جو عربی قراءت پڑھ کر شاناق ہو گیا ہے۔ چانک حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تین سو برس پہلے ایک طبیب تھا۔

اب تک جو کچھ ہوا تھا گو بہت کچھ تھا مگر مامون الرشید کے فیاضانہ حوصلوں کے سامنے تمام پچھلی کوششیں گمنامی کے پردے میں چھپ گئیں، مورخین نے مامون کے اس جوشِ التفات کی ایک عجیب دلچسپ حکایت لکھی ہے یعنی ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک محترم شخص تخت پر جلوہ فرما ہے، مامون نے بڑھ کر پوچھا آپ کون بزرگ ہیں، تخت نشین نے کہا: ارسطو، مامون نے جھک کر عرض کی اے حکیم! اچھی کیا چیز ہے، خیالی ارسطو نے جواب دیا کہ جسے عقل اچھا کہے۔ دوبارہ مامون نے درخواست کی کہ میرے لیے کچھ نصیحتیں ارشاد ہوں، جواب ملا کہ "توحید اور صحبت نیک" خواب کا کچھ اثر ہوا ہو یا نہیں مگر اس واقعہ سے مامون کے شوق اور محویت کا ضرور اندازہ ہوتا ہے، غرض سب جو کچھ ہو مامون نے قیصر روم کو نامہ لکھا کہ ارسطو کی کل تصانیف بہم پہنچائی جائیں، یہ وہ زمانہ تھا کہ خلفائے عباسی کے خطوط قیصر قسطنطنیہ پر فرمان کا اثر رکھتے تھے، قیصر تعمیل ارشاد کے لیے آمادہ ہوا مگر روم کے اطراف میں فلسفہ خود گمنام ہو چکا تھا، بڑی تلاش سے ایک راہب ملا جس نے پتہ دیا کہ یونان میں ایک مکان ہے جو قسطنطین کے زمانے سے مقفل ہے اور جتنے تاجدار تخت نشین ہوتے گئے قفلوں کی تعداد بڑھتے گئے، قسطنطین نے اس مکان میں اس غرض سے فلسفہ کی کتابیں بند کرا دی تھیں کہ اگر فلسفہ و حکمت کو آزادی ملی تو دین مسیح کو سخت صدمہ اٹھانا پڑے گا، قیصر روم کے حکم سے یہ پر خطر خزانہ کھلوا لیا تاہم خیال ہوا کہ مسلمانوں کے ساتھ اس قسم کی فیاضی مذہباً ممنوع تو نہ ہو لیکن ارکانِ دولت نے قیصر کی تسکین کر دی کہ اچھا ہے، فلسفہ مسلمانوں میں پہنچا تو ان کے مذہبی جوش کو بھی ٹھنڈا کر دے گا، غرض پانچ اونٹ لاد کر فلسفہ کی کتابیں مامون کی خدمت میں روانہ کی گئیں۔ (۱)

مامون نے خود بھی حجاج بن مطر و ابن البطریق کو جو یونانی و سریانی زبان کے بڑے ماہر تھے، اس غرض سے روم بھیجا کہ اپنی پسند سے کتابیں انتخاب کر کے

---

(۱) ناسخ التواریخ مصنفہ لسان الملک سپہر جلد اول حالات ارسطو کے ذیل میں یہ پوری تفصیل مذکور ہے۔

لا میں، بیت الحکمۃ کا مہتمم اور قیصر جس کا نام سلما تھا وہ بھی ان دونوں کے ساتھ گیا (۱)
مامون نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جیسا کہ کرمن صاحب (۲) لکھتے ہیں، اس کے
کارندوں نے آرمینیہ، شام، مصر میں قدیم یونانی کی کتابیں جمع کیں جن کا ترجمہ اس
کے حکم سے نہایت حاذق مترجم نے زبان عربی میں کیا، اسی زمانہ میں قسطا بن
لوقا بعلبکی ایک عیسائی تھا جو اپنے شوق سے روم گیا اور فلسفہ کی بہت سی کتابیں اپنے
ساتھ لایا، مامون نے اس کی شہرت سے مطلع ہو کر بلا بھیجا اور بیت الحکمت میں ترجمہ
کے کام پر مقرر کیا (۳) سہل بن ہارون کو جو ایک فارسی الاصل حکیم تھا فارسی کتابوں
کے ترجمہ کا اہتمام سپرد ہوا (۴)۔ سب سے بڑا نامور حکیم اور مختلف زبان کا ماہر اور
مترجم یعقوب کندی تھا جو خاص تصنیفات ارسطو کے ترجمہ پر مامور تھا (۵)، وہ ایک
عیسائی امیر تھا اور اس کا باپ کوفہ کا گورنر رہ چکا تھا، فارسی، ہندی، یونانی زبان جانتا تھا
اور مامون کا نہایت معتمد اور مقرب تھا، مامون نے خود بھی یونانی زبان سیکھ لی تھی،
چیمبرس انسائیکلوپیڈیا میں ہے (۶) "مامون نے یونان کے بادشاہ کو پانچ من سونا دینا
اور صلح رکھنی کا اس شرط پر وعدہ کیا کہ تعلیم لیکر اجازت دی جائے کہ وہ کچھ دنوں کے
لیے آکر مامون کو فلسفہ سکھا جائے۔"

فلسفہ کے لیے اتنی قیمت صرف کرنے کی مثال دنیا میں نہیں مل سکتی ہے، شاکر منجم
کے تینوں بیٹے محمد، احمد، حسن نے بھی جو ہندسہ و نجوم و موسیقی میں اپنا جواب نہیں رکھتے
تھے اور مامون کے خاص مقرب اور ندیم تھے، اس کام پر بہت توجہ کی، اپنے ذاتی شوق
سے روم کے اطراف میں قاصد بھیجے اور فلسفہ و نجوم کی بہت سی کتابیں منگوائیں۔

---

(۱) یہ پوری تفصیل کشف الظنون باب الحکمۃ میں ہے۔ (۲) کرمن صاحب کی روایت
اصفہانی وصر سفناتان، باب سوم آغاز دولت عباسیہ (۳) مختصر الدول حالات یعقوب کندی
(۴) فوات الوفیات ترجمہ سہل بن ہارون (۵) ہسٹری آف قانون ملکی مصنفہ مسٹر لوئس صاحب
فلسفہ عرب حالات یعقوب کندی (۶) کتاب مذکورہ ذکر عرب

بعض اتفاقی ذریعوں سے بھی مسلمانوں کو دوسری قوموں کے خیالات و مسائل معلوم ہوئے، جس زمانہ میں فتوحات اسلامی کا سیلاب ہندوستان کی سرحد سے اونچے اونچے مقامات سے گذر رہا تھا، ہندوستان کا ایک صوفی عالم جس کا نام انبوجر برہمن تھا مسلمانوں سے مذہبی مباحثہ کے لیے روانہ ہوا اور سلطان علی مردان کے زمانہ میں شہر لکھنوتی پہنچ کر قاضی رکن الدین سمرقندی سے ملاقات کی، مباحثہ کا ارادہ تو جاتا رہا بجائے اس کے علوم عربیہ سیکھنے شروع کیے۔ اس نے قاضی صاحب کی خدمت میں ایک کتاب جس کا نام امرت کنڈ تھا پیش کی اور اس کے مطالب بیان کیے تو قاضی صاحب اس کے مسائل سے پوری آگہی حاصل کرنے کے ایسے شائق ہوئے کہ اس سے سنسکرت پڑھنی شروع کی، اور اس زبان سے واقف ہو کر پہلے فارسی میں اور پھر عربی میں کتاب مذکور کا ترجمہ کیا، تاہم اس کے مشکل مقامات جو شرح کے محتاج تھے، اتفاق سے انبوجر کا ایک شاگرد جو اتا جو پال واسلامیہ میں پہنچا تو ایک سنسکرت داں عالم نے اس سے یہ کتاب پڑھی اور عربی زبان میں اس کا نہایت عمدہ ترجمہ کیا، جس کا نام مرآۃ المعانی لادراک العالم الانسانی ہے۔ (۱)

سلطان فیروز شاہ والی ہندوستان قریباً ۷۷۰ھ میں جب جوالا مکھی پہاڑ پر گیا تو لوگوں نے اطلاع کی کہ اس بت خانہ (۲) میں ۱۳۰۰ کتابیں قدیم زمانہ کی موجود ہیں، فیروز شاہ نے ان کے ترجمہ کیے جانے کا حکم دیا، موسیقی و نجوم وغیرہ کی تصنیفات ترجمہ کی گئیں، نجوم کی ایک کتاب عز الدین نے نظم میں ترجمہ کی۔

علوم و فنون کے تراجم کی یہ ایک مختصر سی تاریخ ہے، اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ کس

---

(۱) یہ پوری تفصیل جامع القصص البہیہ میں مذکور ہے، یہ بھی خیال ہے کہ ایک عربی داں مصنف نے سنسکرت بھاشا الفاظ کا تتبع اور پورا ادا کیا ہے، جس طرح کہ ہم سب یورپ کے نام لکھتے ہیں، بعض کتاب میں بھی اسی طرح درج ہیں۔ (۲) دیکھو تاریخ جامع فی حالات فیروز شاہ، ان کتابوں میں سے بعض کے ترجمے مشاہیر مصنف عبد القادر بدایونی نے خود بھی کیے۔

APOLO NIUSPERGEOUS وغیرہ وذلک) عربی ہی زبان کے ذریعہ سے محفوظ ہیں، ورنہ ان کی اصل جاتی رہی ہے۔ یورپ اسلامی کوششوں کا ممنون ہے اور امید ہے کہ ان ترجموں کی نسبت اس کا فیصلہ تعصب کی آلائش سے خالی ہوگا، رینن صاحب لکھتے ہیں: "ان عربی ترجموں کی خوبی پر رناوٹ (RENAUDOT) نے خوب بحث کی ہے اور کسیرا (GASIRA) نے دیانت داری سے اس کی حمایت کی ہے، ہسٹری آف فلاسفی مصنفہ ہنری لوئیس (G. HENERY LEWES) میں ہے، مسٹر لکھتا ہے کہ "بعض ترجمے نہایت خوبی سے کیے گئے" لیکن ایک فرانسیسی مصنف کا بیان ہے کہ "اکثر ترجمے اصل یونانی سے نہیں بلکہ شامی ترجموں سے ہوئے اور ترجمہ در ترجمہ ہونے کی وجہ سے بہت غلطیاں رہ گئیں" گو ہم اس امر کو کسی قدر تسلیم کرتے ہیں اور نہ صرف اسی بنا پر بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ترجمہ گو کتنا ہی صحیح ہو تاہم یہ دعویٰ نہیں ہو سکتا ہے کہ اصل مطلب بالکل پورا پورا ادا ہو گیا لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس قسم کی غلطیوں نے اسلامی تحقیقات پر کوئی محسوس اثر پیدا نہیں کیا، مسلمان فلاسفر، یونانی فلاسفروں کی اصلی غلطیوں کے درست کرنے والے تھے، ان جزئی غلطیوں سے ان پر کچھ اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ (۱)

مسلمانوں کا خود ترجمہ کرنے کی طرف مائل نہ ہونا رینن صاحب کے نزدیک اسی فخر اور غرور کا اثر ہے جو عرب کا اصلی خاصہ ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "اہل عرب اپنی زبان کی کثرت الفاظ پر بھروسہ کر کے غیر زبان کے محاورہ کو حقیر سمجھتے تھے، انھوں نے اپنی عیسائی رعایا میں سے یونانی مترجم چھانٹ لئے" عرب کی پر فخر طبیعت کا خاصہ ہم کو بھی معلوم ہے لیکن افسوس ہے کہ رینن صاحب کی بدگمانی نے اس کا اندازہ اعتدال سے

---

(۱) طبعیات میں ارسطو اور موجودات میں فیثاغورث پر بوعلی سینا و فارابی نے جو قابل قدر نکتہ چینیاں کی ہیں وہ عام طرح سے مشہور ہیں۔ ہنری لوئیس صاحب نے بھی مانا ہے کہ فارابی نے فیثاغورث کی غلطیاں درست کر دیں۔

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
کتاب السماء و العالم	ارسطو	متی	یہ کتاب چار مقالوں میں ہے، قاضی ابوالولید ابن الرشد نے اس کا خلاصہ کیا (معجب)
کتاب الثیاذک	"		حنین بن اسحاق نے اس کی شرح لکھی اور خلاصہ کیا۔
کتاب جرمی الشمس والقمر وبعدھما	"		علامہ نصیر الدین طوسی نے اس کی اصلاح کی۔
کتاب النبات	"	اسحاق	دو مقالے ہیں، ثابت بن قرہ نے اصلاح کی۔
کتاب المرآۃ	"	حجاج بن مطر	
کتاب الحس والمحسوس	"	متی بن یونس	قاضی ابوالولید نے اس کا خلاصہ کیا اور شرح لکھی (معجب) تین مقالوں میں ہے۔
سر الاسرار	"		مامون رشید کے حکم سے ترجمہ ہوئی، اس میں سکندر کے لیے ارسطو نے وصیتیں کی ہیں۔
کتاب السیاست	"		سات مقالوں میں ہے، اس کو ارسطو نے سکندر کے لیے لکھا تھا۔
کتاب الاخلاق	"	حنین بن اسحاق و یحییٰ بن عدی وغیرہ	اس میں بارہ مقالے ہیں، فرفوریوس نے اس کی تفسیر کی ہے۔

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
کتاب النفس	...		حنین نے پوری کتاب کا ترجمہ سریانی میں کیا اور بعض مقالوں کا اسحاق نے۔ ثامسطیوس نے اس کتاب کی جو مبسوط شرح لکھی تھی اس کا ترجمہ اسحاق نے ایک خراب نسخہ سے کیا اور پھر ایک عمدہ نسخہ سے مقابلہ کر کے صحیح کیا۔
قاطیغوریاس	...	حنین بن اسحاق	یعنی مقولات عشرہ۔ ابونصر فارابی، ابوبشر متی، ابن مقفع، ابن بہریز، کندی، یحیٰی بن عدی، احمد بن طیب رازی نے شرحیں لکھیں۔
باری ارمینیاس	...	...	یعنی مباحث الفاظ۔ حنین نے سریانی میں اور اسحاق نے عربی میں ترجمہ کیا اور یحیٰی نحوی، ابوبشر متی، فارابی نے شرحیں لکھیں۔ اسحاق بن مقفع، کندی، ابن بہریز، رازی، ثابت بن قرہ، احمد بن طیب نے تلخیص و مختصر کیا۔
انالوطیقا	ارسطو	تیاذورس	یعنی تحلیل قیاس۔ حنین نے سریانی میں اور اسحاق نے عربی میں اس کے بعض اجزا ترجمے کیے۔ یحیٰی نحوی

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
			وکندی نے اس کی شرح لکھی، ابو بشر متی نے دو مقالوں کی شرح کی
انولوطیقائے ثانی	"	اسحاق وغیرہ	یعنی برہان، حنین نے بعض اجزا سریانی میں ترجمہ کیے، اور متی نے اس ترجمہ کی عربی کی، یحییٰ نحوی، ابو یحییٰ مروزی نے اصل کتاب پر نکتہ چینیاں کی ہیں، متی کندی، فارابی نے شرحیں لکھیں۔
طوبیقا		یحییٰ بن عدی	یعنی جدل، اسحاق نے سریانی میں ترجمہ کیا اور یحییٰ بن عدی نے اس ترجمہ کی عربی کی، دمشقی نے بھی سات مقالوں کا ترجمہ کیا اور ابراہیم بن عبداللہ نے آٹھ مقالوں کا، یحییٰ بن عدی نے اس کی جو تفسیر لکھی وہ ہزار ورق میں ہے۔ فارابی، متی نے شرحیں لکھیں۔ اسکندر افرودیسی نے جو شرحیں اس پر لکھیں ہیں ان کا ترجمہ اسحاق نے عربی میں کیا۔
سوفسطیقا	ارسطو	ابن ناعمہ وغیرہ	یعنی مغالطہ، ابن ناعمہ و ابو بشر متی نے سریانی میں ترجمہ کیا اور یحییٰ

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
			ابن عدی نحوی کی ابراہیم نے عربی میں نقل کیا اور شرح لکھی، [illegible] بھی اس پر شرح ہے۔
ریطوریقا	؍؍	اسحٰق ابراہیم	یعنی خطابیات، فارابی نے شرح لکھی جو سو ورق میں ہے۔
بوطیقا	؍؍	ابو بشر متی و یحییٰ ابن عدی	یعنی شعر، کندی نے اس کو مختصر کیا۔
کتاب طبعی مشہور بہ سمع الکیان	؍؍		یہ کتاب آٹھ مقالوں میں ہے، مقالہ اول کی تفسیر اسکندر افرودوسی نے کی، جس کا ترجمہ ابو روح صابی نے عربی میں کیا اور یحییٰ ابن عدی نے اس کی اصلاح کی، دوسرا مقالہ حنین نے سریانی میں ترجمہ کیا، یحییٰ نے اس کو عربی میں نقل کیا، تیسرا مقالہ موجود نہیں ہے، چوتھے مقالہ کی تفسیر اسکندر افرودوسی نے تین مقالوں میں کی ہے جن میں سے دو مقالے کامل اور تیسرے کا کچھ حصہ قسطا بن لوقا نے ترجمہ کیا، قسطا نے پانچویں اور ساتویں مقالے کا ترجمہ کیا اور

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
			آٹھویں کی شرح لکھی، فرفوریوس یونانی نے اس کے چار مقالوں کی جو شرح لکھی ہے، اس کا ترجمہ بسیل نے کیا اور ابوالبشر متی نے دوبارہ نقل کیا، ثامسطیوس نے بھی اس پر شرح لکھی ہے، جس کا ترجمہ متی نے سریانی میں کیا، ابواحمد نے مقالہ اول و چہارم کی شرح لکھی، ثابت بن قرہ نے مقالہ اولی و ثانیہ پر حاشیہ لکھا، ابراہیم بن الصلت نے مقالہ اولی کی شرح کی، ابوالفرج بن قدامہ نے [illegible] زبان میں جو شرح لکھی ہے، عربی زبان میں اس کا بھی ترجمہ ہوا، اس کتاب پر علمائے اسلام نے بہت سی شرحیں اور حاشیے لکھے۔
سماع عام	ارسطو	یحییٰ بن عدی وغیرہ	چھ مقالوں میں ہے، اول بطریق، حنین نے اس کے بعض حصے ترجمہ کیے، قسطا بن لوقا نے اس کے سو مسئلوں پر تعلیق ہے، ابوزید بلخی نے ابوجعفر خازن کے لیے اس کی شرح لکھی، ابوہاشم نے

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
			اصل کتاب پر رد و قدح کیا اور اعتراضات لکھے جو تصحیح کے نام سے مشہور تھا۔
کتاب الکون والفساد	ارسطو	حنین وغیرہ	حنین نے سریانی میں ترجمہ کیا اور اسحاق دمشقی نے عربی میں۔ اسکندر نے اس کی شرح لکھی ہے، جس کا ترجمہ متی نے کیا اور ابو زکریا یحییٰ بن عدی نے اس کی اصلاح کی۔ یحییٰ نحوی نے بھی اس کی شرح لکھی۔ مقالہ اولیٰ کا ترجمہ قسطا نے بھی کیا۔ لاسکندروس یونانی نے جو شرح لکھی ہے اس کا ترجمہ بھی عربی زبان میں کیا گیا۔
کتاب فی الآثار العلویہ	"	یحییٰ بن بطریق وغیرہ	الاسکندروس یونانی نے اس کی شرح لکھی ہے، جس کو ابو بشر متی نے عربی میں نقل کیا۔ اسکندر افرودیسی کی بھی شرح ہے، جس کا ترجمہ عربی زبان میں کیا گیا۔ ثامسطیوس کی شرح کا ترجمہ اسحاق نے عربی میں کیا۔ یحییٰ بن عدی و حنین وغیرہ نے بھی اصل کتاب کے ترجمے سریانی وعبرانی میں کیے۔

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
کتاب الحیوان	"	ابن البطریق	۱۹ مقالوں میں ہے انیسواں مقالہ اس سے اس کو تفسیر ہے جس کا ترجمہ یحییٰ بن عدی نے عربی میں کیا۔

تقی الدین مجیر نے تاریخ الحوادث میں لکھا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کے وقت ارسطو کی کتابوں میں سے کتاب الادویہ کتاب زیر جد کتاب الحیوان میری نظر سے گذری ہیں۔

اقلیدس

حجاج ابن یوسف کوفی نے دو ترجمے کیے، پہلا ہارونی کے لقب سے مشہور ہے اور دوسرا مامونی کے نام سے، دوسرا ترجمہ عمدہ اور صحیح ہونے کی وجہ سے زیادہ شائع ہوا، حجاج کے نسخے میں کل شکلیں ۴۶۸ ہیں مگر ثابت کے نسخے میں ۱۰ شکلیں اور زیادہ ہیں، کچھ مقالے ابو عثمان دمشقی نے بھی ترجمے کیے، عبداللطیف طبیب کے پاس جو رومی نسخہ تھا اس میں چالیس شکلیں اور زائد تھیں جن کا اس نے ترجمہ کرنا چاہا تھا، علمائے اسلام نے نہایت کثرت سے اقلیدس پر شرحیں اور حاشیے لکھے مثلاً: جوہری، ماہانی، ابو حفص الحرث، محمد خراسانی، ابو الوفاء، الجوزجانی، ابو القاسم انطاکی، احمد بن محمد الکرابیسی، ابو یوسف الرازی، قاضی ابو محمد عبد الباقی البغدادی المشہور بہ قاضی بیمارستان (۸ سیمجان)، ابو علی الحسن بن الحسین بن الہیثم البصری، ابو جعفر خازن، اہوازی، ابو داؤد سلیمان بن عقبہ، محقق طوسی، ماہانی نے صرف پانچویں مقالے کا ترجمہ کیا اور ابو یوسف رازی نے صرف دسویں مقالہ کا، قاضی عبدالباقی کی شرح نہایت بسیط ہے، اس نے اشکال کی مثالیں اعداد سے بھی دی ہیں، ابن ہیثم نے اس کے مصادرات کی شرح لکھی اور ایک کتاب اس پر اعتراض و جواب کی لکھی، ابو جعفر خازن و اہوازی کی

شرح صرف دسویں مقالے پر ہے، ثابت بن قرہ نے ان علل کی تشریح کی جن پر اقلیدس نے شکلوں کی ترتیب رکھی ہے، اس کتاب کی بہت سی اصلاحیں بھی ہوئیں جن کو تحریر کا لقب ملا مثلاً تحریر تقی الدین، اس تحریر کا نام تہذیب الاصول ہے اور تحریر محقق طوسی جو نہایت عمدہ تر اور شائع ہے اور اسی وجہ سے بہت سے علماء نے اس پر حواشی لکھے جن میں سے علامہ سید شریف قاضی زادہ رومی نامور ہیں۔

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
المعطیات	اقلیدس	اسحٰق	اسحٰق نے عربی میں ترجمہ کیا، ثابت نے اصلاح کی، علامہ طوسی نے تحریر کی، ۹۵ شکلوں میں ہے۔
المناظر	"	"	۶۴ شکلوں میں ہے، علامہ طوسی نے اس کی تحریر کی۔
ظاہرات الفلک	"	"	۲۳ شکلیں ہیں، نصیر الدین طوسی نے تحریر کی، تبریزی نے ان کی شرح لکھی۔
کناش	ہرون القس	ماسرجویہ	یہ حکیم ماسرجویہ بصرہ کا رہنے والا اور یہودی المذہب تھا، مروان کے زمانے میں (غالباً اس کی فرمائش سے) یہ ترجمہ اس نے عربی میں کیا۔
کتاب الجبر والمقابلہ	ابو قسطیس	"	محمد بن محمد یحییٰ الحسن بن ابی الوفاء البوزجانی نے جو ۳۲۸ھ میں موجود تھا اس کتاب کی تفسیر کی۔ (مختصر)

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
المطالع	اسبقلاوس	قسطا بن لوقا بعلبکی	کندی نے اصلاح کی اور علامہ طوسی نے تحریر کی، ۳ مقدمے اور ۹۰ شکلوں پر مشتمل ہے۔
الحتی	افلاطون	”	موفق الدین بغدادی نے اس کو مختصر کیا اور ترتیب دی۔
الفلاحۃ الرومیہ	قسطوس بن اسکور اسکینہ	سرجس بن ہلیا	اس نے پہلا ترجمہ رومی سے عربی زبان میں کیا پھر قسطا بن لوقا بعلبکی، ابوزکریا بن یحییٰ بن عدی اسطاس نے عربی میں الگ الگ ترجمے کیے، فارسی میں بھی اس کا ترجمہ ہوا، جس کا نام ورزنامہ ہے،
الاکرۃ المتحرکہ	اوطولوقس	ثابت	ثابت نے اصلاح کی اور محقق طوسی نے تحریر کی، ایک مقالہ اور بارہ شکلیں ہیں۔
کتاب اللیل والنہار	ثاوذوسیوس		دو مقالے ہیں اور ۳۳ شکلیں، علامہ طوسی نے تحریر کیا۔
کتاب المساکن(۱)	”	قسطا بن لوقا	۱۲ شکلیں ہیں علامہ طوسی نے تحریر کی
کتاب الحشائش	دیسقوریدس	اصطفن بن بسیل	اس کتاب میں نباتات کی تصویریں یونانی قدیم حرفوں میں بنی ہوئی تھیں۔

(۱) اس کتاب کا ترجمہ میں نے خود دیکھا ہے۔

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
کتاب السموم	باریونطی من اہل بروسایہ	ابوبکر احمد	یہ کتاب نبطی زبان میں تھی، ابوبکر احمد بن علی المعروف بابن وحشیہ نے عربی میں ترجمہ کیا۔
کتاب الادویہ	دیسقوریدوس		۵ مقالے ہیں، ابن بیطار شیخ عبداللہ بن احمد مالقی نے اس کی تفسیر کی۔
کتاب تسطیح الکرہ	بطلیموس جالینوس		ابوجعفر احمد بن محمد الطیب المتوفی ۳۶۰ھ نے اس کی شرح لکھی، جو کہ رجب ۳۴۲ھ میں تمام ہوئی
کتاب القوی الطبیعیہ	جالینوس	حنین بن اسحق	۳ مقالوں میں ہے۔
کتاب الحیات	"		ابوجعفر احمد بن محمد الطیب نے اس پر شرح لکھی۔
کتاب الکرۃ والاسطوانہ	ارشمیدس مصری		ثابت بن قرہ نے اصلاح کی مگر چونکہ اصل ترجمہ خراب تھا اصلاح میں بھی بعض مصادرات چھوٹ گئے اور طوقیوس عسقلانی نے اس کے مشکلات کی شرح لکھی جس کا ترجمہ عربی میں اسحق بن حنین نے کیا، علامہ طوسی نے اس کی تحریر کی، ثابت کے نسخے میں

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
			چار مقالے ہیں، چار پہلے مقالوں کا ترجمہ احمد بن موسیٰ نے کیا اور تین پچھلے مقالوں کا ثابت بن قرہ نے جس کو اس حسن و احمد (دونوں بن موسیٰ بن شاکر) نے اصلاح کر کے درست کیا، اہل یورپ نے اس کتاب کو صرف مشرقی ترجموں کے ذریعہ سے پایا کیونکہ اس کی اصل بالکل جاتی رہی۔ (حسن روشن اسپائر)
[illegible] الکبرہ	بلینوس النجار		دو مقالوں میں ہے، پہلے مقالے کے ترجمہ کی ثابت نے اصلاح کی مگر دوسرے مقالے کا ترجمہ بے تکی ہے۔
ما بعد الطبیعۃ	ثاوفرسطوس	یحییٰ بن عدی	یہ مصنف ارسطو کا برادرزادہ تھا، اصلی کتاب سریانی میں تھی۔ (مختصر الدول)
کتاب الحس والمحسوس	،،	ابراہیم بن بکوس	(از مختصر الدول)
اسباب النبات	ثاوفرسطوس	،،	(مختصر الدول)

نام کتاب	نام مصنف یا مترجم	
کلیلہ دمنہ	عبداللہ بن مقفع	کے نیچے تھا۔ مامون الرشید جب مصر گیا تو اس نے اس رسالہ کا ترجمہ کرایا جس کو ایک مصری شخص سے لیا تھا۔ یہ کتاب ہندی زبان سے نوشیروان کے لیے ترجمہ کی گئی پھر اس فارسی کا ترجمہ عبداللہ بن المقفع نے عربی میں کیا جو ابوجعفر منصور کا منشی تھا۔ دوسرا ترجمہ عربی میں عبداللہ بن ہلال اہوازی نے یحییٰ بن خالد برمکی کے لیے کیا جو ۱۶۵ھ میں تمام ہوا پھر سہل بن نوبخت نے یحییٰ بن خالد کے لیے نظم کیا۔ جس کا صلہ اس کو ایک ہزار دینار ملا۔ کلیلہ دمنہ کے ڈھنگ پر سہل بن ہارون نے ایک کتاب مامون الرشید کے لیے لکھی جس میں ہر ایک باب و فصل کلیلہ دمنہ کے معارضے کے طور پر لکھی۔
کتاب الوزیہ	الجوزی	عبداللہ القی نے اس کی شرح لکھی

مدرسے اور دارالعلوم

اگرچہ ۱۳۳ھ کے متصل ہی تمام ممالک اسلامی میں درس و تدریس کا ایک عظیم الشان سلسلہ قائم ہو گیا اور پہلی دو تین صدیوں میں جس درجے کے سیکڑوں ہزاروں مجتہد، فقیہ، ادیب، شاعر، فلسفی، مورخ پیدا ہو گئے بعد کے کئی سو برس کی وسیع مدت میں بھی اس پایہ کے لوگ نصیب نہیں ہوئے لیکن عجیب بات ہے کہ تاریخ کے صفحوں میں چوتھی صدی کے اخیر تک بھی کسی کالج یا اسکول کا نشان نہیں ملتا، مسجدوں کے صحن، خانقاہوں کے حجرے، علما کے مخصوص مکانات، یہی اس وقت کے مدرسے یا دارالعلوم تھے، چیمبرز انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ "مامون الرشید کے زمانے میں عمدہ عمدہ مدرسے بغداد، بصرہ، کوفہ، بخارا میں قائم ہوئے (۱)" اس سے بھی زیادہ واضح انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی شہادت ہے کہ "مامون نے اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں خراسان میں ایک کالج بنوایا جس میں مختلف ملکوں سے نہایت لائق لائق استاد بلا کر مقرر کیے اور مسیوح ایک بڑے فاضل کو جو دمشق کا رہنے والا اور مذہباً عیسائی تھا، کالج کا پرنسپل مقرر کیا" (۲)، اگر یہ روایتیں صحیح ہوں تو مدرسوں کی ابتدائی تاریخ التصنیفات کے عہد سے بہت قریب ہو جاتی ہیں لیکن ہم کو معلوم ہے کہ دنیا کا وسیع النظر مورخ ان شہادتوں کو بے پروائی کی نگاہ سے دیکھے گا اور یہ کہہ دے گا کہ "اپنے گھر کا حال ہم تم سے زیادہ جانتے ہیں۔"

---

(۱) کتاب مذکور، ذکر عرب (۲) کتاب مذکور، حالات مامون الرشید

عام خیال تو یہ ہے اور تعجب ہے کہ علامہ ابن خلکان بھی اس سے متفق ہیں کہ "اسلامی دنیا میں اول جس نے مدرسوں کی بنیاد ڈالی وہ دولت سلجوقیہ کا وزیر اعظم نظام الملک طوسی تھا"۔ ولیت کی تعیین تو ہم بھی نہیں کر سکتے مگر یہ بتا سکتے ہیں کہ نظام الملک سے پہلے علمی عمارتوں کے آثار موجود تھے ۴۰۰ھ میں حاکم مصر نے مصر میں ایک بڑا مدرسہ بنوایا، بہت سی کتابیں اس پر وقف کیں اور فقہ و محدثین درس و تدریس کے لیے مقرر کیے۔(۱)

سلطان محمود غزنوی نے بھی ہندوستان کی بے انتہا دولت کا ایک حصہ اس عمدہ کام میں صرف کیا، متھرا کی فتح سے واپس جا کر تقریباً ۴۱۰ھ میں خاص دارالسلطنت غزنین میں ایک نہایت عالیشان مدرسہ بنوایا، ایک کتب خانہ بھی اس میں شامل تھا، جس میں مختلف زبانوں کی کتابیں نہایت کثرت سے جمع کی گئی تھیں، مدرسہ کے مصارف کے لیے بہت سے دیہات اور مواضع وقف کیے تھے، محمد قاسم فرشتہ کا بیان ہے کہ اس عمدہ نظیر کی تقلید تمام ارکان دولت اور امرا نے بھی کی اور تھوڑے ہی دنوں میں غزنین علمی یادگاروں سے معمور ہو گیا (۲)، دارالسلام بغداد اس فخر کے لیے ہنوز نظام الملک کا انتظار کر رہا تھا لیکن نیشاپور میں بڑے بڑے کالج و اسکول تیار ہو چکے تھے، سلطان محمود کے بھائی امیر نصر نے ایک مدرسہ بنوایا جو سعیدیہ کے نام سے مشہور ہوا، مدرسہ بیہقیہ کے مدرس اعظم ابو القاسم اسکاف اسفرائنی تھے۔

امام الحرمین نے جو امام غزالی کے استاد ہیں اسی مدرسہ میں تعلیم پائی تھی، استاد ابو بکر فورک کو لوگوں نے خطوط بھیج کر بلایا اور جب وہ تشریف لائے تو خاص ان کے درس کے لیے ایک مدرسہ تعمیر ہوا، جس کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ اسلام میں اگر کوئی مدرسہ عام قومی چندہ سے بنا تو شاید یہی تھا، استاد ابو بکر نے ۴۰۶ھ میں وفات

(۱) حسن المحاضرۃ علامہ سیوطی ذکر دوارث عزیہ مصر و ۴۰۰ھ و تاریخ کامل واقعات ۴۰۰ھ

(۲) تاریخ فرشتہ فتح متھرا

یورپ و ایشیا دونوں پر برابر قبضہ کیا ہے۔ اسی خاندان کے یادگار تھے اور نظام الملک طوسی جس کے مبارک ہاتھوں نے نظامیہ بغداد کی بنیاد ڈالی انہی لوگوں کے دربار میں وزیر اعظم تھا (۱) وہ صرف وزیر نہ تھا بلکہ سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ اس نے چھ لاکھ دینار کی رقم خاص اس فیاضانہ کام کے لیے خزانۂ شاہی سے مقرر کی تھی اور تمام قلمرو میں مکتب اور مدرسے قائم کیے تھے۔ نظام الملک کی کل جاگیرات میں سے اس کا دسواں حصہ مدرسوں کے لیے وقف کر دیا تھا (۲) لیکن سب سے بڑا کام جو اس کے ہاتھوں سے پورا ہوا نظامیہ کی تعمیر تھی۔ ابن خلکان اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ ایک سلطان کے وزیر نے بغداد میں مدرسہ قائم کرنے کے لیے دو لاکھ دینار وقف کیے (۳) اور پندرہ ہزار دینار سالانہ اس کے صرف کے لیے مقرر کیے۔ نظامیہ سے چھ ہزار طلبا مختلف وقتوں میں بہرہ اندوز ہوتے، ان میں امراء کے لڑکے بھی تھے اور اہل حرفہ کے بچے بھی۔ غریب طالب علموں کے لیے کافی آمدنی مقرر تھی اور مدرسوں اور محققوں کی تنخواہیں بیش قرار تھیں۔

۴۵۷ھ میں اس کی تعمیر شروع ہوئی اور دہم ذیقعدہ روز شنبہ ۴۵۹ھ کو بڑی شان و شوکت سے کھولا گیا۔ ڈاکٹر ... کا یہ بیان ہے کہ رسم افتتاح کے وقت سارا بغداد امنڈ آیا تھا اور دربار خلافت کی کل عظمت اور قوت نظامیہ کے ہال میں مجتمع تھی۔ ہم قوم کے جوش اور سلطنت کی وسعت کا بھی صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔

---

(۱) ملک شاہ کی سلطنت کاشغر سے بیت المقدس تک طول میں اور قسطنطنیہ سے بحر خزر تک عرض میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس عہد میں گویا وہ تمام ممالک اسلامی کا مالک تھا۔ ۴۰۸ھ میں پیدا ہوا اور ۴۸۵ھ میں وفات پائی۔ نظام الملک نے تیس برس تک اس کے دربار میں وزارت کی۔ ابن خلکان ترجمہ ملک شاہ و نظام الملک۔ (۲) آثار البلاد علامہ قزوینی ذکر بغداد و منتخب فی اخبار المدارس۔

(۳) یہ دینار کم از کم پانچ روپیہ کا ہوتا ہے۔ اس طرح سے حساب لگائیں تو دس لاکھ روپیہ ہوتے ہیں۔

ہم کو ایک رائے قائم کرنے میں مدد ملے گی۔ نظامیہ نے اپنے اثر سے ایک عجیب گرمجوشی تمام ملک میں پیدا کر دی، وہ پانچویں صدی میں قائم ہوا اور چھٹی صدی تک اسلامی دنیا کا کوئی گوشہ (بجز اندلس کے) علمی عمارتوں سے خالی نہ رہا، خراسان کے بڑے بڑے صوبے مثلاً مرو، نیشاپور، ہرات، بلخ اور ایران کے علاقے جو پہلے سے علم و فضل کے مرکز تھے، مگر نظامیہ کے اثر نے اور بھی مالا مال کر دیا، یاقوت حموی قریباً چھٹی صدی میں جب مرو پہنچا تو وہاں بہت سے مدرسے اور کتب خانے موجود پائے، جن مدرسوں کے متعلق بڑے بڑے کتب خانے تھے ان کے یہ نام ہیں، مستوفیہ، شرف الملک ابو سعد محمد بن منصور المتوفی ۴۹۴ھ کا قائم کیا ہوا، عمیدیہ، خاتونیہ اس میں چند کتب خانے تھے، نظامیہ نظام الملک حسن بن اسحٰق کا قائم کیا ہوا۔

یاقوت حموی، معجم البلدان (۱) جیسی عجیب اور جامع کتاب انہیں کتب خانوں کی مدد سے لکھ سکا (۲)، خاص شہر نیشاپور کی کثرت مدارس کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ۵۵۶ھ میں جب اندرونی فسادات نے اس کو غارت کیا تو عام عمارتوں کے ساتھ ۲۵ حنفیہ اور شافعیہ مدرسے بھی برباد ہوئے، ان کے علاوہ بارہ کتب خانے بھی جل گئے یا لوٹ لیے گئے، یزد میں صرف علامہ حسین بن احمد ابوالفضل المتوفی ۵۹۱ھ کے اہتمام میں بارہ مدرسے تھے جن میں بارہ سو طلبہ تعلیم پاتے تھے (۳)۔ خوارزم کا بڑا کالج امام فخر الدین رازی المتوفی ۶۰۶ھ کی پروفیسری سے ممتاز تھا۔ مسٹر شارڈن سیاح فرانس جنھوں نے دولت صفویہ کے زمانے میں ایران کے اکثر مقامات کی سیر کی، اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں کہ "سلیمان صفویہ کے عہد میں خاص شہر اصفہان میں اڑتالیس مدرسے موجود تھے"۔ (مرآت البلدان ناصری جلد اول

(۱) یہ عربی زبان میں ایک جغرافیہ کی کتاب ہے، جو کم و بیش چھ ہزار صفحوں میں ہے اور اس جامعیت سے لکھی گئی ہے کہ عقل حیران ہوتی ہے، یورپ میں چھاپی گئی ہے۔ (۲) دیکھو معجم البلدان حالات مرو (۳) حسن المحاضرہ جلد اول صفحہ ۲۶۲ مطبوعہ مصر ۱۲۹۹ھ

صفحہ ۲۵ مطبوعہ ایران)

خود بغداد میں تقریباً تیس بڑے بڑے کالج موجود تھے جن کے بلند ایوانات اور وسعت عمارت کی نسبت علامہ ابن جبیر کا بیان ہے کہ "ہر ایک بجائے خود ایک مستقل شہر معلوم ہوتا ہے" (سفرنامہ علامہ ابن جبیر حالات بغداد مطبوعہ لیڈن ۱۸۵۲ء میں چھپ گیا ہے۔ علامہ موصوف نے ۵۸۰ھ میں بغداد کو دیکھا تھا۔ بغداد کے بعض مدرسوں کا ہم ایک مختصر سا نقشہ فہرست کے طور پر درج کرتے ہیں۔

مدرسہ	بانی	کیفیت
مدرسہ تاجیہ	تاج الملک مستوفی السلطان	غالباً ۴۸۲ھ میں تعمیر ہوا، امام ابوبکر شاشی مدرس اعظم مقرر ہوئے۔ (کامل ابن الاثیر واقعات ۴۸۲ھ)
مدرسہ مستوفیہ	شرف الملک ابو سعد محمد بن منصور	یہ سلطان ملک شاہ سلجوقی کا مستوفی تھا، ۴۹۴ھ میں وفات پائی، یہ مدرسہ باب الطاق کے پاس تھا۔ (کامل واقعات ۴۹۴ھ)
مدرسہ کمالیہ	کمال الدین ابوالفتوح	صاحب المخزن تھا، یہ مدرسہ ۵۳۳ھ میں تیار ہوا، رسم افتتاح میں بغداد کے تمام اعیان شریک تھے۔ (کامل واقعات ۵۳۳ھ)
مدرسہ ابوالمظفر	ابوالمظفر عون الدین	۵۴۴ھ میں خلیفہ مقتفی بامر اللہ کے دربار میں منصب وزارت پر ممتاز ہوا (ابن خلکان حالات وزیر مذکور)

مدرسہ	بانی	کیفیت
مدرسہ ثقة الدولہ	علی بن محمد معروف بہ ثقة الدولہ	خلیفہ المکتفی کا مقرب تھا، یہ مدرسہ شافعیوں کے لیے خاص تھا، دجلہ کے کنارے پر اس کی عمارت تھی۔ ثقة الدولہ نے ۵۹۴ھ میں وفات کی (ابن خلکان ترجمہ شہدہ فخر النساء)
مدرسہ بہائیہ		نظامیہ کے متصل ہے، ابو منصور محمد ہروی جن کی عظمت و شان ان کے حالات کے پڑھنے سے معلوم ہوتی ہے قریباً ۵٦٧ھ میں پروفیسر مقرر ہوئے، مدرسہ نظامیہ میں بھی وعظ کہا کرتے تھے، نظامیہ کی پروفیسری کے لیے بھی امیدوار کیے گئے تھے۔ (ابن خلکان حالات ابو منصور مذکور)
مدرسہ فخریہ	فخر الدولہ	ان کا باپ وزیر تھا، فخر الدولہ نے ۵۷۸ھ میں وفات پائی۔ (کامل ابن الاثیر واقعات ۵۷۸ھ)
مدرسہ والدہ ناصر لدین اللہ	خلیفہ ناصر لدین اللہ کی والدہ	
مستنصریہ	خلیفہ المستنصر باللہ	اس مدرسہ کا کسی قدر تفصیلی حال ہم لکھتے ہیں، ان مدرسوں کے علاوہ بغداد میں مشہور اہل حنیفہ وقفیہ،

سنہ	بانی	کیفیت
		زیر یہ، حنفیہ، شافعیہ مدارس قدیم عباسیہ شہرت عام رکھتے تھے طبقات الحنفیہ وغیرہ میں ان کے مدرسین وغیرہ کے حالات مل سکتے ہیں۔ بغداد کے اکثر مدارس بغداد کے تباہ ہونے کے بعد بھی قائم رہے۔

دولت عباسیہ کی تاریخ میں یہ بات بڑے الزام کے قابل تھی کہ ان تمام عالی
عمارتوں میں سے ایک بھی کسی عباسی خلیفہ کے نام سے نہ تھی اور دارالخلافہ بغداد اس
خاص حیثیت سے بالکل دوسری قوموں کا ممنون تھا۔ خلیفہ المستنصر باللہ نے جو رجب
۶۲۳ھ میں تخت نشین ہوا، اس الزام کو اٹھانا چاہا، اتنی مدت کی غلطی کا تدارک بھی اسی
مقدار سے ہونا چاہیے تھا اور انصاف یہ ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ باتفاق تسلیم کیا گیا ہے کہ
جس عظمت و شان کا یہ مدرسہ بنا اس کی نظیر سے گذشتہ اور موجودہ دونوں زمانے خالی
ہیں۔ ۶۲۵ھ میں دجلہ کے کنارے اس کی بنیاد کا مبارک پتھر رکھا گیا اور چھ برس کی
مدت میں عظیم الشان عمارت پورا تیار ہوا۔ عمارت کا ایک حصہ جو دجلہ پر تھا (مستنصریہ
کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ ناصر الدین بادشاہ والی ایران نے سفرنامہ ایشیا میں اس
کی گذشتہ شوکت یاد دلانے والی ٹوٹی ہوئی عمارت کا ذکر کیا ہے) اسی سنہ میں ماہ رجب
جمعرات کے دن اس کی رسم افتتاح بڑی شوکت و شان سے ادا ہوئی، جس میں بغداد
کے تمام اعیان و افسران فوج و علماء، مدرسین، قضاۃ و اہل منصب شریک تھے۔ مستنصر
نے تمام اعیان و امراء کو خلعتیں عنایت کیں اور مؤید الدین قمی کی جس کے اہتمام میں
عمارت تیار ہوئی تھی اس کی جاگیر مضاعف کر دی۔ مذاہب اربعہ کے فقہا اور شیخ
الحدیث، شیخ النحو، شیخ القراءت، شیخ الطب درس کے لیے مقرر ہوئے، ایک سو ساٹھ

اونٹ پر بار کر کے عمدہ عمدہ کتابیں کتب خانۂ شاہی سے اس کے استعمال کے لیے آئیں۔ مدرسہ کے احاطہ میں ایک حمام اور مزملہ بھی تھا (جس سے گرمیوں میں پانی ٹھنڈا کرتے ہیں)۔ دو سو اڑتالیس مستعد طلبا مدرسہ کھلنے کے ساتھ ہی داخل ہوئے جن کو مکان، فرش، خوراک، روشنی، کاغذ، قلم وغیرہ مدرسہ کی طرف سے ملتا تھا، ان کے دستر خوان پر معمولی کھانے کے علاوہ شیرینی اور میوے بھی چنے جاتے تھے، ان سب کے علاوہ ایک اشرفی ماہوار ان کے وظیفہ کے طور پر مقرر تھی، سیکڑوں دیہات اور مواضع مدرسہ کے مصارف کے لیے وقف تھے جن کی مجموعی آمدنی ستر ہزار مثقال سونا یعنی آج کل کے حساب سے تقریباً ساڑھے چار لاکھ سالانہ تھی (۱) (علامہ ذہبی نے تاریخ دول الاسلام میں ان مواضع کی پوری فہرست دی ہے)۔ حنفیوں کے مدرس اعظم شیخ عمر ملقب بہ رشید الدین فرغانی تھے جو فقہ، اصول، حکمت، کلام میں بڑے ماہر گنے جاتے تھے، پہلے سنجار کے مدرسہ میں مدرس تھے پھر مستنصر باللہ نے فرمان بھیج کر بلا لیا تھا (۲)۔ مدرسے کے دروازے پر ایک ایوان تھا جس میں ایک نہایت عجیب اور بیش قیمت گھڑی رکھی تھی (۳) جس کو علی بن تغلب بن ابی الضیا ساعاتی ایک مشہور

(۱) دیکھو تاریخ الخلفا سیوطی، حالات مستنصر باللہ و اعلام بتاریخ مکہ صفحہ ۱۶۵ و مرآت البلدان مصری مطبوعہ ایران جلد اول صفحہ ۳۴۴ و دول الاسلام علامہ ذہبی و جواہر مضیہ فی طبقات الحنفیہ ترجمہ عمر بن محمد بن الحسین بن ابی عمر بن محمد ابو حفص الفرغانی مدرس اول مستنصریہ۔ جواہر مضیہ میں مدرسین شافعیہ و مالکیہ و حنبلیہ کے نام بھی لکھے ہیں۔ (۲) آثار البلاد قزوینی ذکر شہر قرنہ۔

(۳) شاید یہ دوسری گھڑی ہے جو دولت عباسیہ کے عہد میں تیار ہوئی، اس سے بہت پہلے ہارون الرشید نے جو گھڑی شاہ فرانس کو بھیجی تھی، یورپ میں وہ تعجب کی نگاہ سے دیکھی گئی، فرانس کے مورخوں کا بیان ہے کہ ہمارے ملک میں پہلی گھڑی وہ ظاہر ہوئی جو ہارون الرشید نے ۸۰۷ء میں شارلمین بادشاہ فرانس کو تحفہ کے طور پر بھیجی تھی، یہ گھڑی ایسی عجیب و غریب تھی کہ تمام دربار فرانس حیرت میں رہ گیا، اس گھڑی میں بارہ دروازے (بقیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ فرمائیں)

شہرت اور عزت دی، یہ دونوں خاندان صرف اسی بات میں نامور نہ تھے کہ انھوں نے مسلمانوں کی بھولی ہوئی عظمت ایک بار اور یورپ کو یاد دلا دی بلکہ اس بات میں بھی کہ ان کی وجہ سے ممالک مصر و شام میں علم کا آوازہ نہایت بلند ہو گیا۔

نورالدین نے حلب، حماۃ، حمص، بعلبک، منبج، رحبہ میں بڑے بڑے مدرسے قائم کیے، خاص دمشق میں جو اس کا پایہ تخت تھا ایک ایسا عظیم الشان مدرسہ بنایا کہ مدت تک بے نظیر تسلیم کیا جاتا تھا، یہ فخر بھی خاص نورالدین کی قسمت میں تھا کہ تمام دنیا میں جو پہلا دارالحدیث قائم ہوا اس کے نام سے ہوا، ورنہ اس سے پہلے خاص علم حدیث کے درس کے لیے کوئی مدرسہ نہیں تعمیر ہوا تھا(۱) علامہ ابن جبیر نے ۵۸۰ھ میں جب دمشق کو دیکھا تو خاص شہر میں ۲۰ کالج تھے، عام حکم تھا کہ جو شخص کوئی مدرسہ قائم کرے اس کو تمام مصارف خزانہ شاہی سے ملیں گے، مغربی طلبا کے لیے خاصۂ سات باغ اور کچھ زمین وقف تھی، جس کی سالانہ آمدنی پانسو اشرفیاں تھیں، جو لڑکے قرآن ختم نہیں کر سکتے تھے ان کو صرف سورہ کہف سے اخیر تک پڑھایا جاتا تھا، ان میں سے پانسو لڑکوں کا وظیفہ خزانہ شاہی سے مقرر تھا(۲) نورالدین نے خاص اپنے ذاتی مال سے مدارس اور مکاتب وغیرہ پر جو جاگیریں وقف کی تھیں اور جو اس کی وفات کے بعد بھی سیکڑوں برس تک قائم رہیں ان کی آمدنی نو ہزار صوری اشرفیاں تھیں۔(۳)

اسی طرح سلطان صلاح الدین نے اسکندریہ، قاہرہ، بیت المقدس، دمشق وغیرہ میں مدرسے قائم کیے اور بے انتہا آمدنی ان پر وقف کی(۴) علامہ ابن جبیر لکھتے

---

(۱) ابن خلکان ترجمہ نورالدین، حسن المحاضرہ ذکر مدرسہ کاملیہ (۲) یہ تمام حالات سفرنامہ علامہ ابن جبیر دمشق کے ذکر میں ہیں۔ (۳) روضتین فی اخبار الدولتین مطبوعہ مصر ۱۲۸۷ھ جلد اول ص ۱۰، روضتین کے مصنف نے ایک عہدہ دار سے جو ان جاگیروں سے تعلق رکھتا تھا، ۶۰۸ھ میں یہ تعداد تحقیق کی تھی۔ (۴) ابن خلکان ترجمہ صلاح الدین

اس زمانہ میں مصر، قاہرہ، دمشق، حلب، اربل کے تمام علاقوں میں جو بے انتہا مدارس قائم ہو گئے ان کو کون شمار کر سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص چاہے تو جواہر مضیہ فی طبقات الحنفیہ، حسن المحاضرہ فی تاریخ مصر وقاہرہ، وفیات الوفیات وابن خلکان وغیرہ سے ایک بڑی فہرست تیار کر سکتا ہے، لیکن ہم اس موقع پر صرف ان بڑے بڑے مدرسوں کا ایک نقشہ دیتے ہیں جو خاندانِ صلاحیہ، نوریہ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض مدرسین کے بھی ہم نام لکھیں گے جس سے معلوم ہوگا کہ جو علما اس زمانہ میں علم و فضل کے ماہر تھے اکثر انہیں مدرسوں کے منصب درس پر ممتاز تھے۔

دولت صلاحیہ

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
شافعیہ یا صلاحیہ	صلاح الدین المتوفی ۵۸۹ھ	مصر	اس میں نجم الدین خبوشانی جو مشاہیر سے تھے مدرس اعظم کے عہدہ پر مقرر ہوئے اور دس مدرس ان کے ماتحت تھے۔ تقی الدین بن دقیق العید، سراج بلقینی، حافظ ابن حجر، بہاء الدین قاضی القضاۃ وغیرہ وقتاً فوقتاً اس میں مدرس مقرر ہوئے۔ نہایت کثیر آمدنی اس پر وقف تھی، علامہ ابن جبیر لکھتے ہیں کہ اس کی وسعت عمارات پر ایک مستقل آبادی کا گمان ہوتا ہے۔

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
شافعیہ	"	"	شاید مصر میں صلاح الدین نے پہلا مدرسہ ۵۶۶ھ میں قائم کیا (روضتین جلد اول ص ۱۹۲)
حنفیہ یا قمحیہ	"	"	مگر یہ ۵۶۶ھ میں قائم ہوا قریباً ۷۸۴ھ میں علامہ ابن خلدون نے بھی اس میں درس دیا (تاریخ ابن خلدون حالات مصنف، روضتین فی اخبار الدولتین)
زین التجار (یا) شریفیہ	صلاح الدین المتوفی ۵۸۹ھ	مصر	عماد الدین میانی، سراج الدین بلقینی (استاذ جلال الدین سیوطی) تقی الدین قاضی القضاۃ وغیرہم اس میں درس دیتے تھے۔
مشہد	"	قاہرہ	یہ مدرسہ صلاح الدین کے نام سے مشہور نہیں ہے (ابن خلکان، حالات صلاح الدین)
صوفیہ	"	"	صوفیوں کے لیے خاص تھا۔

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
صلاحیہ	"	بیت المقدس	اس کے مدرسین کی تنخواہیں بیش قرار تھیں (انس جلیل تاریخ بیت المقدس)
صلاحیہ	"	دمشق	
افضلیہ	الملک الافضل بن صلاح الدین	بیت المقدس	مالکیہ کے لیے خاص تھا۔
ظاہریہ	الملک الظاہر بن صلاح الدین	حلب	ابوالحسن حیی مدرس اعظم تھے
عزیزیہ	الملک العزیز بن صلاح الدین	دمشق	نہایت مشہور اور عظیم الشان مدرسہ تھا، علامہ سیف الدین آمدی المتوفی ۶۳۱ھ مدرس اعظم تھے۔
اسدیہ	اسد الدین شیرکوہ عم صلاح الدین	حلب	علامہ ابن الصلاح کے والد مدرس اعظم تھے۔
ست (یا) زمردیہ	زمرد خاتون ہمشیرہ صلاح الدین	دمشق	زمرد خاتون کے شوہر اور بھائی کی قبریں اسی مدرسہ میں ہیں
منازل العز (یا) تقویہ	الملک المظفر تقی الدین المتوفی ۵۸۷ھ برادرزادہ صلاح الدین	مصر	جزیرہ روضہ کا کل خراج وجامع الذہب کی آمدنی اس پر وقف تھی (مقریزی جلد اول ص ۱۹۱) شافعیوں کے لیے خاص تھی ۵۶۶ھ میں قائم ہوا تھا۔

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
مالکیہ	"	"	مالکیوں کے لیے خاص تھا۔
تقویہ	"	ربا	
عذراویہ	عذرا صلاح الدین کی بھتیجی تھی کی بنی کی۔	دمشق	
دارالحدیث	الملک الاشرف برادرزادہ صلاح الدین	"	علامہ ابن الصلاح المتوفی ۶۴۳ھ مدرس اعظم تھے، علامہ ابن خلکان نے ایک برس تک ان کی خدمت میں تحصیل علم کی۔
معظمیہ	الملک المعظم برادرزادہ صلاح الدین	"	الملک المعظم اور ان کے اکثر عزیز اسی مدرسہ میں مدفون ہیں ملک المعظم تصنیف اور فن ادب وفقہ میں نامور تھا، اس نے عام حکم دیا تھا کہ جس کو زمخشری کی مفصل زبانی یاد ہو سو اشرفیاں اس کو انعام دی جاویں، اس تقریب سے اکثروں نے یہ مفید کتاب حفظ کرلی تھی۔
معظمیہ	الملک المعظم برادرزادہ صلاح الدین	بیت المقدس	اس مدرسہ پر بہت سے دیہات و مواضع وقف تھے، ۶۱۰ھ میں قائم ہوا۔

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
دارالحدیث الکاملیہ	الملک الکامل برادرزادہ صلاح الدین المتوفی ۶۳۵ھ	قاہرہ	یہ دوسرا دارالحدیث ہے، جو ممالک اسلامی میں دارالحدیث نوریہ کے بعد قائم ہوا، حافظ ابن وحیہ، زکی الدین منذری قطب قسطلانی، ابن دقیق العید، ابن سید الناس، حافظ زین الدین عراقی استاد حافظ ابن حجر، وقتاً فوقتاً اس کے مدرس مقرر ہوئے، یہ سب علما اپنے زمانہ میں بے مثل خیال کیے گئے ہیں۔
صالحیہ	الملک الصالح نجم الدین ایوب بن الملک الکامل	‘‘	یہ مدرسہ چار مدرسوں پر مشتمل تھا، مقریزی کا بیان ہے کہ وہ قاہرہ کے نامور اور عظیم الشان مدرسوں میں گنا جاتا ہے، جب وہ کھولا گیا تو شعرا نے قصائد و قطعے لکھے حسن المحاضرہ میں چند اشعار نقل کیے ہیں، ۶۳۹ھ میں قائم ہوا۔
معینیہ	معین الدین خسرو سلطان صلاح الدین	دمشق	

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
شبلیہ	شبل الدولہ	،،	نہایت مشہور مدرسہ ہے، شبل الدولہ زمرد خاتون (ہمشیرہ صلاح الدین) کا غلام تھا۔
عزیہ	عز الدین ایبک	،،	عز الدین الملک المعظم کا غلام اور صرخد کا حاکم تھا، یہ مدرسہ میدان اخضر میں واقع ہے۔
شہابیہ	شہاب الدین طغرل	حلب	الملک العزیز اسی مدرسہ میں مدفون ہے۔
مجیریہ	مجیر الدین	قاہرہ	مجیر الدین مشہور عالم اور سلطان صلاح الدین کا وزیر تھا۔ یہ مدرسہ درب الملوخیہ کے پاس ہے، محرم ۵۸۰ھ میں قائم ہوا۔
بہائیہ	ابو المحاسن یوسف بہاء الدین	حلب	علامہ ابن خلکان اسی مدرسہ کی بورڈنگ میں مدت تک رہے ہیں اور علوم کی تحصیل کی ہے۔
دار الحدیث	،،	،،	
فاضلیہ	قاضی فاضل المتوفی ۵۹۶ھ	قاہرہ	قاہرہ کا مشہور مدرسہ ہے، قاضی فاضل سلطان صلاح الدین کے دربار کا منشی اور نہایت نامور شخص تھا۔

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	
فلکیہ	فلک الدین برادر الملک العادل	دمشق	

خاندان نوریہ

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
نوریہ حنفیہ	نورالدین محمود زنگی المتوفی ۵۶۹ھ	دمشق	نورالدین کی تربت اسی مدرسہ میں ہے، عرقلہ ایک شاعر نے اسی مدرسہ کی شان میں لکھا ہے، دمشق فی المدائن بیت ملک وہذی فی المدارس بیت ملک (روضتین)
دارالحدیث نوریہ	،،	،،	ممالک اسلامی میں حدیث کے درس کے لیے پہلا مدرسہ تعمیر ہوا
نوریہ شافعیہ	،،	،،	یہ مدرسہ خاص شافعیوں کے لیے بڑی عظمت وشان سے تعمیر ہونا شروع ہوا مگر تیار ہونے سے پہلے نورالدین نے وفات کی، پھر الملک العادل برادر صلاح الدین کے اہتمام سے اتمام کو پہنچا

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
عزیہ	عزالدین تیرۃ نورالدین والمتوفی ۵۹۹ھ	موصل	یہ مدرسہ ایوان شاہی کے متصل واقع ہے شافعیہ حنفیہ دونوں فرقوں کے لیے تھا عمدہ اور مشہور مدرسہ ہے عزالدین کی قبر بھی اسی کے احاطہ میں ہے (ابن خلکان و روضتین)
سیفیہ عتیقیہ	سیف الدین غازی برادر نورالدین المتوفی ۵۴۴ھ	"	عالیشان اور مشہور مدرسہ ہے سیف الدین اسی کے احاطہ میں مدفون تھے حنفیہ و شافعیہ کے لیے تھا۔
ارسلانیہ	ارسلان نورالدین شاہ ابن عزالدین مذکور	موصل	عزالدین کے مدرسہ کے مقابل ہے علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ حسن و خوبی میں یہ مدرسہ لاجواب کہا جا سکتا ہے
مدرسۃ الملک القاہر	الملک القاہر ابن نورالدین ارسلان شاہ والمتوفی ۶۱۵ھ	دمشق	نورالدین نے مساجد کے اوقاف کا انتظام ان کے متعلق کیا تھا اور ان کے ایما سے بہت سے مدرسے بنوائے۔
قایمازیہ	ابو منصور قایماز	موصل	ابو منصور سیف الدین غازی کی طرف سے موصل کا حاکم تھا علامہ ابن اثیر مصنف مثل

الجلیل فی تاریخ القدس والخلیل، و ذیل ابن خلکان سے ماخوذ ہے جن پر عبارت ایسے متفرق واقعوں پر مذکور ہیں کہ خاص خاص حوالے نہیں دیے جا سکتے تھے۔

خاندان صلاحیہ کا سلسلہ ۶۵۲ھ میں منقطع ہو گیا اور ۹۲۳ھ تک مصر و عرب کی قسمت اتراک و چراکسہ کے ہاتھ میں رہی، اتراک نے ۷۸۴ھ تک حکومت کی، پھر چراکسہ قابض ہو گئے، یہ دونوں خاندان زر خرید غلام تھے، جو ترقی کر کے منصب حکومت تک پہنچے تھے، ان خاندانوں میں کبھی حکومت خاندان کے سلسلے میں نہیں چلتی تھی بلکہ اور جو کوئی غلام جو فوج میں بھرتی ہونے کے لیے ہمیشہ خریدے جاتے تھے، ان میں سے اقبال نے جس کا ساتھ دیا تخت نشین ہو گیا، ان میں سے اکثر بڑے صاحب اقتدار نے حکمران ہوئے اور علم و فن کی بہت قدر دانی کی، اس عہد میں مدرسوں کو اور بھی ترقی ہوئی، جس کے چند اسباب تھے، مدارس کے تمام اخراجات اوقاف میں داخل ہو چکے تھے اور اگر کوئی بادشاہ یا حکومت ان کو واپس لینا چاہتا تو علماء جن کا عوام پر بہت اثر تھا عموماً مخالف ہو جاتا جیسا کہ ایک بار ۸۰۰ھ میں واقع ہوا، یہ ترکی غلام جن کو کل تک لوگ بازاروں میں بکتے ہوئے دیکھ چکے تھے، اگر خود بھی اس قسم کی فیاضیاں نہ دکھاتے اور اہل علم ان کا ساتھ نہ دیتے تو ان کو تخت حکومت پر بیٹھنا نصیب نہیں ہو سکتا تھا، غرض ان کے عہد میں اس خاندان نے جو علمی فیاضیاں کیں ان کی نظیر پچھلے زمانوں میں نہیں مل سکتی۔

اس عہد سے پہلے مکہ معظمہ میں بہت کم مدرسے تھے، ۵۷۱ھ میں امیر فخر الدین زنجیلی نے مکہ معظمہ میں ایک مدرسہ بنوایا، ۵۸۰ھ میں خلیفہ مستعصم باللہ کی کنیز خاص طاب ثراہا نے ایک مدرسہ قائم کیا جس میں دو فقہاے شافعی مدرس تھے، ۶۲۲ھ میں ایک اور مدرسہ تعمیر ہوا جس کا بانی الملک المنصور عمر بن علی رسولی تھا، مصر کے ترک بادشاہوں سے پہلے مکہ میں جو قابل اعتبار مدرسے موجود تھے، غالباً یہی دو تین تھے لیکن ان ترکوں کے عہد سے مکہ معظمہ بھی دوسرے شہروں کی طرح

ایک بڑا دارالعلوم بنایا گیا۔

میر اسباسلار نے جو سلطان ظاہر بیبرس کی فوج میں ناظر تھا، مکہ معظمہ میں تین عمدہ مدرسے بنوائے، قاہرہ، غزہ، شام میں بھی اس نے بہت سے مدرسے قائم کیے تھے۔

ملک اشرف قاتیبائی نے جو خاندان چرکسیہ میں سے تھا اور ۸۷۲ھ میں تخت نشین ہوا، مکہ معظمہ میں چاروں مذہب کے لیے نہایت عظیم الشان مدرسہ بنوایا، جس میں بہتر کمرے تھے اور بیچ میں جو نہایت وسیع کمرہ تھا اس کی چھت سنگ مرمر کی تھی، مدرسے کا کام تمام ہوا تھا، قاتیبائی جب مکہ معظمہ گیا تو فوج و حشم کے ساتھ اسی مدرسے میں ٹھہرا اور طلبا، قراء، بواب، اہل مطبخ، خبر، خزانچی وغیرہ کی تنخواہیں مقرر کیں، قاتیبائی نے مدینہ منورہ میں بھی ایک عالیشان مدرسہ بنوایا، ابن الناصر محمد بن قلاؤن نے مصر میں جو مدرسہ قائم کیا وہ وسعت و شان کے اعتبار سے تمام دنیا میں بے نظیر سمجھا گیا ہے، ۷۵۸ھ میں اس کی تعمیر شروع ہوئی اور تین برس متصل ہر روز اس کی تعمیر میں بیس ہزار درہم صرف ہوئے، جس کی کل تعداد آج کل کے حساب سے کم و بیش چودہ لاکھ روپیہ ہوتی ہے۔ اس کا بڑا کمرہ جس کو ہیکل یا ہال کہنا چاہیے ۶۵ گز اونچا تھا، خود سلطان ابن الناصر بھی زمانۂ تعمیر میں کثرت مصارف سے عاجز آ گیا تھا مگر یہ خیال ہمیشہ غیرت دلاتا رہا کہ "مصر کا وسیع ملک ایک مدرسے کے صرف سے بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا"۔ چاروں مذہب کے فقیہوں کے لیے مقرر تھے۔ ابن الناصر نے یہ بھی ارادہ کیا تھا کہ چار بڑے بڑے منارے تعمیر کیے جائیں، تین بن بھی چکے تھے مگر جب ۷۶۲ھ میں اتفاقاً ایک منارہ کے گرنے سے تین سو یتیم بچے جو مکتب اصطبل میں پڑھتے تھے دب کر مر گئے تو یہ ارادہ ترک کر دیا گیا۔(۱)

اس عہد میں یہ واقعہ بھی ایک عجیب یادگار ہے کہ ہندوستان کے حکمرانوں میں سے بھی ایک بلند حوصلہ بادشاہ یعنی سلطان غیاث الدین نے مکہ معظمہ میں مدرسہ

---

(۱) یہ پوری تفصیل حسن المحاضرہ و مدرسہ سلطان حسن کے تذکرہ میں ہے۔

قائم کرنے کے لیے شریف مدت پائی نظیر رکھتا تھا۔ یا ہندوستان کا یہ پہلا بادشاہ ہے جس کے نام سے ایک مدرسہ منسوب کیا گیا ہے، ورنہ جیسا کہ ہم آگے چل کر لکھیں گے اس سرزمین میں اس قسم کا خیال کبھی نہیں پیدا ہوا۔ رمضان ۸۱۳ھ میں اس کی تعمیر شروع ہوئی اور ۸۱۴ھ میں اتمام کو پہنچی۔ زمین بارہ ہزار مثقال کو خریدی گئی اور مدرسے کے متعلق بہت سے مکانات و دکانات تیار ہوئے۔ غرہ محرم ۸۱۵ھ میں بڑی شوکت وشان سے کھولا گیا۔ ساٹھ طالب علم اسی وقت مدرسے میں داخل ہوئے اور سب کے لیے وظیفہ مقرر ہوا۔ چاروں مذہب کے مدرس مقرر ہوئے تھے اور ہر ایک کے درس کا الگ الگ وقت مقرر تھا۔ غیاث الدین نے اس کے سوا چار مدرسے اور وہاں قائم کیے۔(۱)

نمونے کے طور پر ہم اتراک و چرکس کے عہد کے چند مدرسوں کا ذکر کرتے ہیں جو خاص اسکندریہ و قاہرہ میں موجود تھے ورنہ یوں تو بلاد مصر و شام میں سیکڑوں ہزاروں مدرسے قائم ہو چکے تھے۔ قاضی مجیر الدین حنبلی نے ۹۰۰ھ میں خاص شہر بیت المقدس کی جو تاریخ لکھی اس میں وہاں کے ۱۳۸ مدرسوں کی فہرست مع تاریخ تعمیر و اسماے بانیان درج کی ہے جو اس کے عہد میں موجود تھے۔ یہ تاریخ جس کا نام انس جلیل ہے ۱۲۸۳ھ میں بمقام مصر مطبع وہبیہ میں چھاپی گئی ہے۔

نام مدرسہ	سنہ تعمیر یا افتتاح	بانی مدرسہ	بعض مدرسوں کا نام	کیفیت
ظاہریہ قدیمہ (۲)	۶۶۲ھ	الملک الظاہر بیبرس بند	علامہ تقی الدین بن رزین [illegible]	ایک کتب خانہ بھی اس پر وقف تھا

(۱) حرمین شریفین کے مدرسوں کا ذکر اعلام و شفاء الغرام تاریخ مکہ میں اجمالاً و تفصیلاً لکھا ہے۔

(۲) مدرسہ [illegible] کے سوا اور باقی مدرسوں کا ذکر علامہ سیوطی نے اجمالاً و تفصیلاً کیا ہے، لیکن بہت سے ضروری حالات میں نے مقریزی، ابن خلکان و حسن المحاضرہ کے مختلف مقامات سے لکھے ہیں

نام مدرسہ	سنہ تعمیر	بانی مدرسہ	بعض مدرسوں کا نام	کیفیت
		قداری المتوفی ۶۷۲ھ	محب الدین بن عبدالرحمن مدرس حنفی، حافظ شرف الدین دمیاطی، مدرس حدیث، کمال الدین قرشی مدرس قرأت	ظاہر نے یورپ و تاتار پر چند بار فتحیں حاصل کیں، اس کی فتوحات اور بہت کی عالی شان تعمیرات و مصارف سلطنت کو تحفہ ابن خلکان میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔
منصوریہ		ملک منصور قلاوون المتوفی ۶۸۹ھ	ابوحیان برہان الدین امین الدین شاگرد ابن الہمام	یہ مدرسہ نہایت عظیم الشان تھا، علامہ تقی مصنف تھا ابن خلکان نے لکھا ہے کہ یہ مدرسہ اور اس میں جو ہسپتال تھا بے نظیر خیال کیے گئے ہیں۔ ملک منصور بڑی طاقت و جبروت کا بادشاہ تھا اور اس کے خاندان نے اکثر یورپ پر فتحیں حاصل کیں

ان مضامین کا ترجمہ ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

History of the attomana Turks, By Sir Edward Creasy, M.A. latachief justice of Oeylonedondon Richard Benlly & son

جس سے ترکی مدرسوں کی نسبت ایک معتبر رائے قائم کی جا سکتی ہے، یہ مورخ ترکی خاندان کے آئین ملکی اور عام انتظامات کے ذیل میں لکھتا ہے "محمد ثانی سے پہلے جو بادشاہ ہوئے وہ اور ان میں خاص کر ارخان مدرسے اور کالجوں کے قیام کا از حد شوق تھا لیکن محمد ثانی ان سب سے بڑھ کر نکلا اور اس کے زمانے میں تعلیم کا بڑا چرچا ہوا اور عالم لوگ بڑے بڑے عہدے پانے لگے۔ قسطنطنیہ کا فاتح بخوبی جانتا تھا کہ سلطنت کے قیام اور وسعت کے لیے علاوہ جوانمردی اور قواعد دانی کے کچھ اور بھی ضروری ہے، چونکہ وہ خود پڑھا لکھا تھا اس لیے اس نے اپنی رعایا کی تعلیم میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ محمد نے علاوہ ابتدائی مدرسوں کے جو مکتب کے نام سے مشہور ہیں اور ہر گاؤں میں کثرت سے پائے جاتے ہیں، بڑے بڑے مدرسوں کی بنیاد ڈالی، طالب العلموں کو دس مختلف مضمونوں میں تعلیم ہوتی تھی، صرف، نحو، منطق، تاریخ، زبان، طرز تحریر، علم فصاحت و بلاغت، اقلیدس، ہیئت، جو طالب العلم ان دسوں مضامین میں دستگاہ کامل حاصل کرتے تھے، دانشمند کا خطاب پاتے تھے، یہی سب مضامین مثل دسوں مولوی فاضلوں کے چھوٹے لڑکوں کو پڑھاتے تھے، دانشمندوں کو ابتدائی مدرسوں کی اعلیٰ مدرسی مل سکتی تھی، لیکن جماعت علما میں داخل ہونے کے لیے ان کو بہت کچھ قانون (فقہ سے مراد ہے) پڑھنا اور متواتر امتحان دینے ہوتے تھے اور درجہ بدرجہ سند پاتے تھے، یہ تعلیم بے شبہ اسی تعلیم کے مطابق ہے، جو چودھویں صدی میں پیرس اور کیمبرج میں دی جاتی تھی اور اس بات کا بہت خیال کیا جاتا تھا کہ علما میں صرف وہ لوگ داخل ہوں جو ذکی طبع اور ذی لیاقت ہوں ان لوگوں کو بڑی عزت اور فیاضانہ

مد اور مذہب سے متعلق تھے، اسی جماعت علما میں سے بڑے بڑے کالجوں کے علمی مدرس، قاضی، مفتی اور شیخ مقرر ہوتے تھے، مسجدوں کے امام اور واعظ علما کے بعد ہیں، دنیا میں بجز ترکی کے کوئی ایسا ملک نہیں جہاں علمائے مذہب ایسے ذی اقتدار ہوں، گو شرع ایسی قوی ہو، عثمانی اس بات میں بڑے قابل عزت ہیں کہ وہ لوگ مدرسوں اور علما کی بڑی عزت کرتے ہیں جس کا نشان بھی عیسائی قوموں میں نہیں پایا جاتا۔"

ترکوں میں ارخان (متوفی ۷۲۶ھ) پہلا فرماں روا تھا جس نے مدرسوں کی بنیاد ڈالی، اس کا ازنیق کا مدرسہ نہایت مشہور ہوا، داؤد قیصری جن کی شرح فصوص الحکم مشہور ہے اور علاء الدین شارح وقایہ وغیرہ مدرس تھے، سلطان مراد کے زمانے میں وہاں کے مدرس اعظم کی تنخواہ ۱۳۰ درہم یومیہ تھی، ارخان کے جانشینوں نے اس سلسلہ کو بہت ترقی دی اور محمد خان فاتح کے عہد میں حد کمال کو پہنچ گیا، محمد خان نے بچپن میں عمدہ تعلیم حاصل کی تھی لیکن اس کا علمی شوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ حکومت کے زمانے میں بھی وہ طالب العلمی کرتا رہا اور علامہ خواجہ زادہ، علامہ ابن الخطیب وغیرہ علما خاص اس کے پڑھانے پر مقرر تھے۔

محمد فاتح نے ۸۶۷ھ میں بمقام قسطنطنیہ ایک بڑی یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی جس کے ماتحت آٹھ کالج تھے اور سب کے ساتھ جداگانہ بورڈنگ تھے، یہ عظیم الشان عمارت رجب ۸۷۵ھ میں تمام ہوئی، علاء الدین طوسی، خواجہ زادہ، ملا عبد الکریم، محمد بن مصطفی اور بہت سے علما مدرس مقرر ہوئے جن میں سے اکثر کی تنخواہ سو درہم یومیہ تھی، محمد خان خود بھی ان مدرسوں میں درس کے وقت کبھی کبھی شریک ہوتا تھا، ایک بار علامہ علاء الدین طوسی کے درس میں حاضر ہوا، شرح عضدیہ سید شریف کا درس ہو رہا تھا، علامہ کی حسن تقریر سے ایسا محظوظ ہوا کہ روز مرہ حاضر ہوتا تھا، سبق ختم ہوا تو دس ہزار درہم علامہ کو اور پانچ پانسو درہم طلبا کو صلہ دیا، علامہ علاء الدین قوشجی کو مدرسہ ایا صوفیہ کا مدرس اعظم کیا اور دو سو درہم یومیہ تنخواہ مقرر کی، علامہ قوشجی کی شرح تجرید

خواجہ زادہ کے محاکمہ تہافۃ الفلاسفہ امام غزالی نے شہرت عام حاصل کی ہے، یہ کتاب بھی محمد خان کی فرمائش سے لکھا گیا تھا، جس کے صلے میں اس نے دس ہزار درہم عنایت کیے تھے۔

بایزید خان نے جو ۸۸۶ھ میں تخت نشین ہوا، بہت سے مدرسے قائم کیے۔ اس زمانے میں مدرسین کے علاوہ جتنے نامور علما تھے سب کی تنخواہیں بشرح دس ہزار عثمانی سالانہ مقرر کر دیں اور جو لوگ شرح مفتاح سکاکی کا درس دیتے تھے ان کی تنخواہ چار ہزار سالانہ مقرر کی، حرمین شریفین کے فقہا کے لئے چودہ ہزار اشرفی سالانہ کا حکم دیا۔ سلطان سلیمان نے جو ۹۲۶ھ میں سریر حکومت پر بیٹھا علاوہ اور مدارس کے ۹۷۲ھ میں مکہ معظمہ میں چار بڑے بڑے مدرسے تعمیر کرائے۔ قاضی مکہ نے بنیاد کا پتھر رکھا اور تمام علما نے ان کی مشایعت کی۔ ہر مدرس کی تنخواہ اس وقت ۵۰ عثمانی یومیہ بکہ سو عثمانی مقرر ہوئی۔ ان مدرسوں میں طب و حدیث کا بھی درس ہوتا تھا۔ قسطنطنیہ میں بہت سے عمدہ مدرسے بنوائے اور چھ سو طلبہ کا وظیفہ مقرر کیا (عقد المنظوم فی افاضل الروم) سلطان سلیم نے پچھلی کوششوں میں اور بہت کچھ اضافہ کیا، مراد نے جو ۹۸۲ھ میں تخت نشین ہوا، مکہ معظمہ میں بمقام صفا ایک مدرسہ بنوایا جس میں ایک مدرس، ایک معید اور بیس دانش مند تھے۔ (۱)

ترکوں کی علمی تاریخ کا ہم نے نہایت چھوٹا حصہ اور وہ بھی نہایت اختصار کے ساتھ ناظرین کے سامنے پیش کیا ہے، ترکوں کی حکومت کو کم و بیش آج چھ سو برس ہو گئے۔ اس وسیع مدت میں بیسیوں سلاطین، سیکڑوں وزراء، ہزاروں اہل منصب نے نہایت حوصلہ مندی سے فیاضیاں دکھائیں، ایک مختصر سے آرٹیکل میں ان کی اجمالی صورت بھی نہیں دکھائی جا سکتی، شقائق نعمانیہ فی علماء الدولۃ العثمانیہ و عقد المنظوم فی

---

(۱) ترکی مدارس کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے، آثار الدول قرمانی، اعلام و شفاء الغرام بر دو تاریخ مکہ، شقائق نعمانیہ فی علماء الدولۃ العثمانیہ و عقد المنظوم فی ذکر افاضل الروم سے لکھا ہے۔

نام مدرسہ	مقام مدرسہ	بانی	شرح تنخواہ	کیفیت
مرادیہ	قپلوجہ	سلطان مراد ثانی محمد خان	۹۰ روپیہ	
مرادیہ	بروسہ	"	۵۰-۸۰ روپیہ	ملا نعمت اللہ معروف بروشنی زادہ
جلویہ	ادرنہ	"	۵۰ روپیہ	
محمودیہ	قسطنطنیہ	محمود پاشا وزیر اعظم	۵۰ روپیہ	عرب زادہ
مرادیہ	"	مراد پاشا	۵۰ روپیہ	
قلندریہ	"	"	۵۰ روپیہ	
مدرسہ ابی ایوب	"	"	۸۰ روپیہ	
بایزیدیہ	"	بایزید خان	۱۰۰ روپیہ	
بایزیدیہ	اماسیہ	"	۸۰ روپیہ	
ابراہیمیہ	قسطنطنیہ	ابراہیم پاشا	۸۰ روپیہ	
مدرسہ علی پاشا	"	علی پاشا	۵۰ روپیہ	
مدرسہ مصطفی پاشا	"	مصطفی پاشا	۵۰ روپیہ	
رستمیہ	"	رستم پاشا وزیر کبیر	۵۰ روپیہ	شمس الدین خلف مفتی ابوالسعود مفسر مدرس تھے، یہ سترہ برس کے سن میں

نام مدرسہ	مقام مدرسہ	بانی	شرح تنخواہ	کیفیت
مدرسہ طرابزون	طرابزون	والدۂ سلطان سلیم خان	۵۰ روپیہ	ملا نعمت احمد معروف بہ دشتی زادہ
دار الحدیث	قسطنطنیہ	سلطان سلیمان خان	۱۰۰ روپیہ	ملا کوچ امین
مدرسہ خسرویہ	,,	امیر الامرا خسرو	۵۰ روپیہ	
سلیمانیہ	دمشق	سلطان سلیمان خان	۸۰ روپیہ	
مدرسہ الطبیہ	افضیہ	پیری پاشا	۵۰ روپیہ	
تکلیو زہ		مصطفیٰ پاشا	۵۰ روپیہ	
دار الحدیث	ادرنہ		۲۰۰ روپیہ	ملا شمس الدین قاضی زادہ مدرس تھے۔
احمدیہ	چورلے	احمد پاشا وزیر اعظم	۵۰ روپیہ	ملا کوچ امین
سلیمانیہ	ازنیق	سلیمان پاشا	۵۰ روپیہ	
مدرسہ تکلیو زہ	تکلیو زہ	مصطفیٰ پاشا		
اخلیہ	قسطنطنیہ	,,	۵۰ روپیہ	

آخیر میں مجھ کو یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ ترکی مدارس کو جو ترجیح ہے اور جس کا میں اعتراف کر چکا ہوں وہ زیادہ تر سلسلۂ انتظام، اصول ترقی، انضباط قواعد، کثرت مصارف کی رو سے ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ وہاں سے تعلیم یافتہ طلبا کو باقاعدہ ملکی عہدے ملتے تھے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جس قدر پولیٹکل پلہ بھاری ہوا کمال علمی کا وزن کم ہوتا گیا، یہی بات ہے کہ چھ سو برس کی مدت میں ان مدارس سے ایسے کم لوگ اٹھے جو حکیم یا محقق کا لقب حاصل کر سکے۔ علامہ ابن خلدون نے تو کلیۃً نفی کی ہے۔

لیکن اگر صاحب کشف الظنون کی فہرست تمام تسلیم بھی کر لی جائے تاہم اس کا انحصار ترکوں کے وسیع سلسلۂ حکومت سے موزوں نسبت نہیں پیدا کر سکتا، حقیقت یہ ہے کہ ایشیا کی تاریخ میں کمال کو دنیوی جاہ و منصب کی خواہش سے کم تعلق رہا ہے۔

ہمارے آرٹیکل کا یہ حصہ جس میں خاص قسم کے مدارس اور دارالعلوم سے بحث ہے، ختم کے قریب ہے اور صرف دو ناموں کی جگہ اس میں اور خالی ہے یعنی اندلس (اسپین) و ہندوستان، اس بات کا ہم کو بھی افسوس ہے کہ اسپین جو تیغ و قلم دونوں میں خلافت بغداد کا حریف مقابل تھا، اس خاص سلسلہ میں سب سے اخیر نمبر پر ہے، ہم قرطبہ (کارڈوا) غرناطہ (گرینڈا) کی شہرت اور عظمت کے منکر نہیں ہیں، قرطبہ کے نقشہ میں ہم ۳۸۳۷ مسجدیں، ۶۰۳۰۰ عام، ۲۱۳۰۷۷ عام رعایا کے مکانات دیکھتے ہیں، قصر الزہراء، کامل، مجدد، قصر الحائر، روضہ مبارک، قصر السرور، رشیق، تاج، بدیع (۱) کے بلند اور زیب و زینت سے معمور عمارتیں بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں لیکن اس تمام وسعت میں کسی کالج یا اسکول کا ہم کو نشان نہیں ملتا، بے شبہ قرطبہ کی علمی شہرت بغداد سے کم درجہ پر نہیں ہے، بے شبہ یورپ کی استادی کا فخر اسپین ہی کا خاص حصہ ہے، لیکن اس وقت اصطلاحی مدارس سے بحث ہے، جس کے معنی اتنے ہی تک محدود ہیں کہ خاص درس و تدریس کی غرض سے کوئی عمارت تیار کی گئی ہو، اسپین کی بجا طرفداری علامہ مقری سے زیادہ کوئی شخص نہیں کر سکتا، جو اسپین کی ایک ایک خوبی کو تمام اور ممالک اسلامیہ کے سامنے اس دعویٰ سے پیش کرتا ہے کہ ”تم ایک کا بھی جواب لا سکتے ہو“ تاہم اس محقق اور وسیع النظر مورخ نے صاف صاف اقرار کیا ہے کہ ”تمام اسپین میں ایک بھی مدرسہ نہ تھا، صرف مسجدوں کے صحن تھے جن میں تمام علوم و فنون پڑھائے جاتے تھے۔“ (۲)

---

(۱) یہ سب قرطبہ کے عالیشان عمارات و باغات کے نام ہیں۔　(۲) دیکھو نفح الطیب تاریخ اندلس مطبوعہ فرانس جلد اول صفحہ ۱۳۶

تھے ان کو پہلے قرآن اور معمولی خط و کتابت اور کسی قدر حساب سکھایا جاتا تھا، پھر فقہ کی تعلیم ہوتی تھی اور بعض تیز طبع نوجوان معتد بہ لیاقت تک پہنچ جاتے تھے، اس کے بعد نیزہ بازی اور تیر اندازی اور پھر شہسواری سکھائی جاتی تھی، جو ان کی تعلیم کا انتہائی ذریعہ تھا لیکن یہ طریقہ بھی کسی باقاعدہ ہیئت اجتماعی کی صورت نہیں رکھتا تھا اور غالباً تمام ممالک اسلامیہ میں حربی تعلیم کا یہی انداز تھا، خلیفہ عبدالمومن بن علی کا مدرسہ حربیہ خاص طور قابل ذکر ہے، جس کی تفصیل ہسٹری آف ڈومنین آف عربین مصنفہ کانڈی (۱) سے قریب قریب اس کے لفظوں میں نقل کرتے ہیں۔

اس (عبدالمومن) نے ایک اسکول لڑکوں کے لیے بنایا، جس میں صرف علوم نہیں بلکہ سپہ گری کے کام بھی سکھائے جاتے تھے کیونکہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ صرف پڑھے لکھے قاضی تیار ہوں بلکہ اس کی خواہش تھی کہ ایسے لائق گورنروں کے لیے اور فائق گروہ تھا جو شہروں کے انتظام کے لیے پیدا ہوں اور بڑے بڑے جنرل اور اچھے جنگ آور اس کے سکول سے تعلیم پا کر نکلیں، ان کالج اور اسکولوں میں وہ مصامدہ اور دوسری قوموں کے شریف خاندانوں سے جو ان کے ملک میں رہتے تھے، لڑکے جمع کرتا تھا جن کی تعداد تین ہزار تھی اور جو قریب قریب ایک ہی عمر ہونے کی وجہ سے ایسے معلوم ہوتے تھے کہ گویا ایک ہی دن کے پیدا ہیں۔ یہ لڑکے حافظ اور طالبین کہلاتے تھے، کیونکہ وہ موطا و اصول المہدی حفظ یاد کرتے تھے اور ایک دوسری بھی پڑھتے تھے جس کا نام بابطاب الاقتضی تھا، حافظین کو بادشاہ جمعہ کے دن اکٹھا جمع کیا کرتا تھا، جس دن کہ دربار سجایا کرتا تھا وہ ان کو حکم دیتا تھا کہ تختے مجر کا پڑھا اس کے سامنے دہرائیں، ہفتہ میں ایک دوسرے دن ان کو حکم دیتا تھا کہ شہسواری، ہتھیاروں کے کرتب، نیزہ بازی، گھوڑ دوڑ اور بہت سی مشقوں کا جو سپاہیوں کے لیے ضروری ہیں تماشا دکھلائیں، تیسرے دن ان کی تیر اندازی کی مشق دیکھتا تھا اور ایک اور

(۱) دیکھو تاریخ مذکور جلد ثانی صفحہ ۳۲۷ مطبوعہ لندن ۱۸۴۳ء

دن ان کی شناوری کی استعداد یاں ملاحظہ کرتا تھا جس کے لیے اس نے اپنے باغ میں
ایک بڑا اور وسیع تالاب بنوایا تھا، جو تین سو قدم لمبا اور اتنا ہی چوڑا تھا، تالاب میں مختلف
قسم کی کشتیاں اور اور قسم کی جو کہ خود اس نے ایجاد کی تھیں اور اس وضع کی اس سے پہلے
کبھی نہیں دیکھی گئی تھیں، پڑی رہتی تھیں، وہ ان کشتیوں پر حافظین کو سوار کراتا تھا، جن
میں بیٹھ کر ایک دوسرے پر حملہ کرتے اور اپنے آپ کو بچانے میں وہ بڑی پھرتی اور
چالاکیاں دکھلاتے تھے، عبد المومن خود ان کو کشتیوں کے کھینے اور کسی خاص سمت سے
جانے اور تمام ان اعمال کے طریقے بتاتا تھا جو سمندر میں جہازوں کے استعمال کے
لیے ضروری ہیں، اس طرح پر ہفتہ کا ہر ایک دن کام میں لایا جاتا تھا اور ہر کام کے لیے
ایک خاص دن مقرر تھا، یہ نوجوان بڑے جوش سے اپنا کام کرتے تھے، بعد ان
گراں قدر انعاموں کے جو کہ عبد المومن کی طرف سے ان نوجوانوں کو دیے جاتے
تھے جنھوں نے فتح حاصل کی ہے یا اپنے فرائض میں زیادہ مشاق ہیں، یہ سب خرچ
عبد المومن خود دیتا تھا، یہاں تک کہ ہتھیار اور گھوڑے بھی اسی کے عنایت کیے ہوئے
ہوتے تھے، ان حافظین میں ۱۲ اشخاص خود عبد المومن کی اولاد تھے جو ہتھیاروں کے کام
اور دوسری قسم کی مشقوں میں نہایت چالاک تھے، اس کے علاوہ وہ ذاتی اخلاق میں
بھی نہایت برگزیدہ اور ممتاز تھے۔

یہ سب مدرسے وہ تھے جو ممالک اسلامیہ میں قائم ہوئے لیکن مسلمانوں کی
علمی فیاضی اس وسیع دائرے میں بھی محدود نہ تھی، انھوں نے یورپ کے خاص شہروں
میں بھی رصد خانے، صنعت گاہیں اور مدرسے قائم کیے، جن میں سے ایک کا ذکر گبن
صاحب کی تاریخ سے انھیں کے الفاظ میں کرتا ہوں، وہ رومن امپائر حصہ مسلمانان فتح
سالرنو کے ذیل میں لکھتے ہیں "افریقہ اور ہسپانیہ اور سسلی میں جو عرب کی نو آبادیاں
تھیں، ان کو یونانی دواؤں سے واقفیت حاصل ہوئی اور بعد اختتام جنگ و صلح علم کا
پرتو سالرنو جیسے مشہور شہر میں چمکا، ایک مدرسہ جو اول ہی اول فرنگستان کے تاریک جہالت

میں قائم ہوا جو فن جراحی کے لیے مخصوص تھا۔ اس مفید اور صحت بخش پیشہ کے لیے پادریوں اور راہبوں کی منظوری لے لی گئی تھی اور بہت سے نامی گرامی مریض دور دور مقامات سے سالرنو کے اطبا کے پاس رجوع کرتے تھے یا ان کو طلب کرتے تھے، یہ اطبا نارمنڈی کی فتحمندیوں سے ظلِ حمایت میں رہتے تھے۔ قسطنطین نام افریقہ کا ایک عیسائی انتیس برس سفر میں رہ کر اور زبان و علم عربی کی تحصیل کامل کر کے بغداد سے واپس آیا۔

اس طرح بو علی سینا کے شاگردوں کے مطب اور ہدایات اور تجربیات سے سالرنو مالا مال ہو گیا۔

☆☆☆

اسلام کے حلقے میں داخل ہو رہی ہیں لیکن اب تک اس وسیع دنیا میں سلطنت کی طرف
سے نہ کوئی سررشتۂ تعلیم ہے، نہ یونیورسٹیاں ہیں، نہ مدرسے ہیں، عرب کی نسلیں
حکمراں ہیں مگر حکومت ان کی بے تعلق اور اوپری ہے کہ ملک کے عام اخلاق، معاشرت
تمدن پر فاتح قوم کی تہذیب کا اثر چنداں نہیں پڑ سکتا، تمام علوم پر عربی زبان کی مہر لگی
ہے، ان سب باتوں پر دیکھئے، علوم و فنون کس تیزی اور سرعت سے بڑھتے جاتے
ہیں، مرو، ہرات، نیشاپور، بخارا، فارس، بغداد، مصر، شام، اندلس کا ایک ایک شہر بلکہ
ایک ایک گاؤں علمی صداؤں سے گونج رہا ہے، عام تعلیم کے لیے ہزاروں مکتب قائم
ہیں جن میں سلطنت کا ہاتھ بھی دستگیر نہیں ہے اور جو آج کل کے تحصیلی مدارس سے زیادہ
مفید اور فیض رساں ہیں، وسطی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مسجدوں کے صحن، خانقاہوں کے حجرے
علما کے ذاتی مکانات ہیں، لیکن ان سادہ اور بے تکلف عمارتوں میں جس وسعت اور
فیاضی کے ساتھ علم کی تربیت ہو رہی ہے، بڑے بڑے عالیشان قصر و ایوان میں بھی
جو پانچویں صدی کے آغاز تک اس غرض سے تعمیر ہوئے اس سے کچھ زیادہ نہ ہو سکی،
اگرچہ اس وقت اس زمانہ کا کوئی رجسٹر نہیں موجود ہے، جس سے ہم حساب لگا سکیں کہ
فیصدی کتنے آدمی تعلیم یافتہ تھے۔ لیکن تذکرے، تراجم، اسماء الرجال، طبقات کی
سیکڑوں ہزاروں کتابیں موجود ہیں جن سے ہم صحیح اندازہ کے قریب پہنچ سکتے ہیں،
اگرچہ متواتر انقلابات، تخت گاہوں کی بربادی، اسپین کی تباہی، تاتاری عام غارت
گری کے بعد ہمارے پاس جو کچھ رہ گیا ہے، وہ ہزار میں ایک بھی نہیں ہے اور اس وجہ
سے ہزاروں لاکھوں ناموروں کی صورتیں زمانہ کی تاریکی نگاہ سے چھپ گئی ہیں، تاہم
اس عہد میں ہم سیکڑوں ماہرین مجتہدین فن کا نشان دے سکتے ہیں، صرف ہم عصر و ہم
وطن اہل کمال کی فہرست تیار کی جائے تو بھی بہت سی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں، ڈاکٹر
اسپرنگر صاحب تخمینہ کرتے ہیں (شاید حسن ظن ہو) کہ "مسلمانوں کے اسماء الرجال
میں پانچ لاکھ مشہور عالموں کا ذکر مل سکتا ہے"۔ اب اگر یہ قیاس کیا جائے کہ تعلیم یافتہ ★

دوسری چیز جو اس تعلیم کے لیے گویا لازمی تھی، مناظرہ کی مجلسوں میں شریک ہونا تھا، مشہور شہروں میں بحث و مناظرہ کے لیے خاص وقت اور مقام مقرر تھے، بعض امرا اس قسم کی مجالس اپنے مکانوں پر منعقد کرتے تھے، فقہ، ادب، نحو وغیرہ ہر ایک علم کے لیے جداگانہ مجالس تھیں، ان میں علما اور طلبہ دونوں شریک ہوتے تھے اور کوئی ممتاز عالم بحث کے تصفیے کے لیے انتخاب کیا جاتا تھا، یہ جلسے جن میں زیادہ تر انصاف اور حق پسندی کا امتحان ہوتا تھا، معمولی طرح پر تعلیم ختم کرنے کی بہ نسبت بہت زیادہ مفید اور پراثر تھے، تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد استاد ایک تحریری سند عنایت کرتا تھا، جس میں اس کی تعلیم کی ایک اجمالی کیفیت اور درس دینے کی اجازت لکھی ہوتی تھی اس سند میں وہ طیلسان پہننے کی بھی اجازت دیتا تھا، جو علما کا مخصوص لباس تھا۔ (۱)

تعلیم کی وسعت کے متعدد اسباب تھے، (۱) تعلیم مذہب کا ایک ضروری جزو بن گئی تھی، قرآن، حدیث (جس پر مذہب کی بنیاد تھی) عربی زبان سے ساتھ خصوصیت رکھتے ہیں، اس تعلق سے نحو، صرف، لغت، معانی، ادب، اسماء الرجال بھی گویا مذہبی تعلیم کے ضروری اجزا تھے، فلسفہ نے علم کلام کی صورت میں مذہبی علم ہونے کی عزت حاصل کی تھی، اس سلسلے نے بڑھتے بڑھتے قریباً ہر علم و فن کو اپنے دائرہ میں لے لیا تھا، اب خیال کرو کہ ایک قوم جس میں اسلام کا جوش ابھی تازہ ہے، جس کی رگوں میں خون عرب کا موجود ہے، جس کی ہمتیں بلند، ارادے مستقل، حوصلے وسیع ہیں، اور جس ملکی کامیابیوں نے اس کے جوش کو تیز تر کر دیا ہے، جب کسی کام پر پوری توجہ سے مائل ہوگی تو کس حد تک بڑھا کر رہے گی، عرب کے سوا دوسری قومیں جو اسلام قبول

---

(۱) علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ اول جس شخص نے علما کے لیے خاص لباس قرار دیا وہ قاضی ابو یوسف صاحب ہیں، علما کا لباس اب بھی چلا آتا ہے، لباس طیلسان کے علاوہ ایک جبہ ہوتا تھا جو آج کل کی عبا اور عمامے کے لباس سے بہت مشابہ تھا، اس میں بڑی گنجائش ہوتا تھا (دیکھو حسن المحاضرہ جلد ثانی صفحہ ۲۲۲ مطبوعہ مصر)

کر چکی تھی، مذہب نے ان کو بھی انھیں سرگرم جذبات سے بھر دیا تھا جو عرب کے ذاتی خاصے تھے اور چونکہ وہ مدت سے تمدن و معاشرت کی آبادی میں بسر کرتے آئے تھے، تعلیم کے معاملے میں انھوں نے اپنے استاد (عرب) سے زیادہ کام دیا، یہی بات ہے کہ نحو، لغت، حدیث، اصول، فقہ، فلسفہ کے امام و پیشوا قریباً کل عجمی ہیں، علامہ ابن خلدون نے اس پر مقدمۂ تاریخ میں ایک مستقل مضمون لکھا ہے، جس کی سرخی یہ ہے "حملۃ العلم فی الاسلام اکثرہم العجم" یعنی اسلام میں علم کے حاملین اکثر عجم ہیں، ہمارے اکثر اخوان جو عرب کی نسل سے ہیں اس بات کو رشک اور تعجب سے سنیں گے مگر ان کو ہشام و عیسیٰ (۱) کی طرح صبر کرنا چاہیے۔

(۲) تعلیم مسجدوں اور مدرسوں کی خاص درس گاہوں میں مقید نہ تھی۔ وزرا، حکام، فوجی افسر، اہل منصب، ہر طبقہ کے لوگ پڑھتے پڑھاتے رہتے تھے، وزارت کے کثیر الاشغال وقت میں بھی بوعلی سینا کی خدمت میں مستعد طلبہ کا ایک گروہ حاضر رہتا تھا۔

(۳) تعلیم میں نہایت آزادی تھی، کسی مقررہ نصاب کی پابندی ضروری نہیں تھی جو شخص جس خاص فن کو چاہتا تھا حاصل کر سکتا تھا، اہل کمال کے زمرے میں سیکڑوں گذرے ہیں جو ایک فن میں امام تھے اور دوسرے فن میں معمولی طالب العلم کا بھی درجہ نہیں رکھتے تھے۔

(۴) امرا اور اہل منصب کا گروہ جو شائقین علم کی سرپرستی کرتا تھا عموماً تعلیم یافتہ اور پایہ شناس تھا، تعلیم کی اشاعت کا یہ بہت بڑا سبب تھا، سلاطین و وزرا تو ایک

---

(۱) ہشام بن عبدالملک دولت بنو امیہ کا نامور خلیفہ تھا، راوی کا بیان ہے کہ مجھ سے ہشام نے پوچھا کہ اس وقت شہر میں علم کا سردار کون ہے۔ میں نے کہا عطا (ہشام) وہ عربی الاصل ہے (میں) نہیں، اسی طرح اس نے شام، مصر، جزیرہ، خراسان، بصرہ کی نسبت پوچھا میں نے مکحول، یزید، میمون، ضحاک کے نام لیے، ہر نام پر پوچھتا جاتا تھا کہ عربی الاصل ہے اور مجھ سے "عجمی" کا لفظ سن کر پیچ و تاب کھاتا جاتا تھا، اخیر میں میں نے کہا کہ ابراہیم نخعی جو کوفہ کا امام ہے عربی الاصل ہے، اس پر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ "خیر اس سے مجھ کو تسکین ہوئی" (فتح المغیث صفحہ ۴۹۸) عیسیٰ کی نسبت بھی ایک اسی قسم کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

طرف، معمولی سے معمولی رئیس کی خدمت میں سیکڑوں ادیب و فاضل موجود ہوتے تھے اور چونکہ ان کی تنخواہیں کسی خدمت کے بدلے نہیں بلکہ صرف ان کا ذاتی کمال اور قبولِ عام مجتبے و اسموں کو خرید اجا تا تھا، تمام ملک میں لیاقت اور شہرت پیدا کرنے کا ایک عام جوش پھیل گیا تھا، تصنیفات میں زورِ سعی کے ساتھ تحقیق و احتیاط کا لحاظ اس لیے زیادہ تر کرنا پڑتا تھا کہ جن قدردانوں کے سامنے پیش کرنا چاہیے، وہ خود صاحب النظر اور نکتہ سنج ہیں۔

مدرسوں کے قائم ہونے نے دفعۃً کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی، نصابِ تعلیم قریباً وہی رہا جو پہلے تھا، بے اعتنائی تعلیم کا جو عموماً قائم رہیں اور حق یہ ہے کہ جب تک ان پر کچھ زوال نہیں آیا تعلیم بھی نہایت وسعت سے جاری رہی، لیکن رفتہ رفتہ ان مدرسوں میں خاص خاص قاعدوں کی پابندیاں شروع ہوئیں اور سلطنتِ عثمانیہ کے زمانے میں تو گویا تعلیم کا ایک جداگانہ قانون پاس کیا گیا، آٹھویں صدی سے پہلے فارغ التحصیل ہونے کے لیے ایک خاص مدت معین ہو چکی تھی، جو ملکوں کے اعتبار سے مختلف تھی، مثلاً مغرب (مراکو وغیرہ) میں سولہ برس اور تیونس میں پانچ برس طالب کو تعلیم کا مکمل رہنا لازمی تھا، املا کا طریقہ بھی رفتہ رفتہ جاتا رہا، آٹھویں صدی میں حافظ زین الدین عراقی نے (حافظ ابن حجر کے استاد تھے) اس کو زندہ کرنا چاہا اور قریباً چار سو مجلسوں میں اس طرح درس بھی دیا، حافظ ابن حجر و سخاوی نے بھی ان کی تقلید کی مگر انھیں بزرگوں پر خاتمہ ہو گیا، جلال الدین سیوطی نے ارادہ کیا مگر لوگوں کی بے توجہی دیکھ کر خود باز رہے۔

یہ مدرسے اکثر مذہبی تھے اور کسی ایک مذہب کے ساتھ خصوصیت رکھتے تھے دارالعلوم نظامیہ صرف شافعیوں کے لیے تھا، مستنصریہ وغیرہ میں چاروں مذہب کا درس ہوتا تھا مگر مدرسین و نصابِ تعلیم بالکل جداگانہ تھے، اس خصوصیت نے مذہب پر ایک نمایاں اثر ڈالا، چوتھی صدی میں جا کر اس سے پہلے تقلیدِ مذہبی کی بنیاد پڑ چکی تھی،

مگر ان مدرسوں نے چونکہ اس کو محسوس صورت میں دکھا دیا تو قوم میں اس کا عام رواج
ہوگیا اور نہایت سختی کے ساتھ ہوا، شاہ ولی اللہ صاحب نے تقلید شخصی کی ابتدا چوتھی صدی
کے بعد قرار دی ہے (۱)، ہر شخص بآسانی یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ ان مدرسوں نے جو
تقلید شخصی کے ہم زمانہ ہیں، خود تقلید کو پیدا کیا ہوگا یا کم سے کم اس کو ترقی اور استواری
دی ہوگی، مدرسوں کے ابتدائی زمانہ میں تو ایسے علما کثرت سے تھے جو اجتہاد کا حق
رکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ تقلید کے عام رواج نے علوم اجتہادیہ کی قوت کو اس قدر گھٹا دیا
کہ گویا قوم سے اجتہاد کی قابلیت ہی باقی نہ رہی، شاہ ولی اللہ صاحب نے کتاب
الانصاف میں نہایت سچ لکھا ہے کہ اس زمانے میں (یعنی پانچویں چھٹی صدی میں)
تقلید ہی ضروری تھی۔

تیسرے دور میں اس بات نے تعلیم کو نہایت ابتر کر دیا کہ جو فن مقصود
بالذات نہ تھے مثلاً نحو، صرف، منطق، و امثال ذلک ان کی تعلیم میں وہ اہتمام اور
موشگافیاں ہونے لگیں کہ عمر کا ایک بڑا حصہ انھیں کی نذر ہو گیا اور اتنا وقت نہیں رہا
کہ جن علوم کی تکمیل مقصود اصلی تھی ان پر پوری توجہ ہو سکتی۔ "تصانیف کی کثرت اور ان
کا درس میں داخل ہونا" (۲) اس بات نے بھی نہایت ضرر پہنچایا، پہلے اور دوسرے
دور میں زیادہ تر فن کی تعلیم ہوتی تھی، لیکن تیسرے دور نے کتابی تعلیم کی بنیاد ڈالی جس
میں اصلی مسائل سے زیادہ کتاب کی عبارت اور اس کے متعلقات سے بحث ہوتی تھی،
ہمارے ہندوستان میں تو ضمیروں کے مرجع اور حیثیت تعلیلی و تقییدی و بعدیت ذاتی
و زمانی کے تنگ دائرے سے طلبا تو کیا اساتذہ بھی کبھی باہر نہیں نکلے۔

ان مدرسوں میں (چند مدارس کے سوا) فلسفہ و منطق کی تعلیم کا بہت کم
اہتمام تھا اور اکثر مدرسوں میں تو ان علوم نے رسائی ہی نہیں پائی، لیکن اس کا الزام

(۱) دیکھو حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۵۸ (۲) علامہ ابن خلدون نے ان دونوں باتوں پر نہایت عمدہ
بحث لکھی ہے، دیکھو مقدمہ تاریخ فصل ۶ کی فصل ۳۰، فصل ۳۲

بانیان مدرسہ پر نہیں ہے بلکہ قوم کے ان بزرگواروں پر ہے، جو دینی یا دنیوی حیثیت
سے قوم پر حکمراں تھے، ہم لکھ آئے ہیں کہ مسلمانوں میں علوم کی بنیاد مذہب کی زمین پر
رکھی گئی، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مذہبی پیشواؤں کی اجتہادی رائیں جدھر رخ کریں
علوم بھی ان کا ساتھ دیں، اسی وجہ سے سلطنت اسلامی کے ہر گوشے میں رہ رہ کر فلسفہ کو
صدمے اٹھانے پڑتے تھے، معتضد باللہ خلیفہ عباسی نے جو ۲۷۹ھ میں تخت نشین ہوا،
پہلے ہی سال فرمان نافذ کیا کہ کتب فروش فلسفہ کی کتابیں نہ بیچنے پائیں (۱) حکیم ابن
رشد کو اپنی فلسفی تصنیفات سے اس لئے خود انکار کرنا پڑا کہ خاندان عبدالمومن (سلاطین
مراکو) نے اسی جرم پر اس کو قید کر دیا تھا، اسی خاندان کے ایک فرمانروا نے جس کا نام
مامون تھا، حکیم ابن حبیب کو قتل کرا دیا (۲) سلطنت عثمانیہ میں بھی ایک مفتی صاحب نے
فلسفہ کا درس بند کر دیا (۳) امام جلال الدین سیوطی نے علم منطق کے ناجائز ہونے
پر ایک کتاب بھی تصنیف کر ڈالی جس کا نام "القول المشرق فی تحریم الاشتغال بالمنطق"
ہے، علامہ ابن الصلاح نے بھی اس مضمون کا ایک فتویٰ لکھا (۴) علامہ ابن تیمیہ
مامون الرشید پر ہمیشہ ترس کھاتے تھے، کہ یقیناً اس جرم پر (فلسفہ کو رواج دیا)
"خدا اس سے کیا مواخذہ کرتا ہے" الغرض گو امرا اور خواص فلسفہ کے حامی تھے، لیکن
عوام کی برہمی کے خوف سے کبھی اس علم کو عام آزادی نہیں دی گئی (۵) تاہم مجھ کو
اقرار کرنا چاہیے کہ فلسفہ کے دوستوں کی تعداد (جو معمولی نہیں) دشمنوں سے زیادہ تھی۔

مذہب نے تعلیم پر جو بڑا نمایاں اثر دکھایا، وہ یہ ہے کہ قدیم عربی زبان
نہایت احتیاط سے محفوظ رکھی گئی، قدیم عربی ایک مدت سے نہ ملک کی زبان ہے،
نہ حکومت کی، فارس و خراسان کی زبان فارسی تھی، عباسی جو بغداد میں خلیفہ مانے

---

(۱) تاریخ الخلفاء ذکر معتضد باللہ (۲) نفح الطیب تاریخ اندلس مقری جلد ثانی صفحہ ۱۲۵

(۳) کشف الظنون ذکر علم حکمت (۴) حسن المحاضرہ حافظ جلال الدین سیوطی

(۵) نفح الطیب جلد اول صفحہ ۲۰۳،

فیاضیاں دکھائے، اس بات سے تعجب اور افسوس دونوں ہوتا ہے کہ پچھلی تعلیم جس کا اثر اب دنیا کو اب بھی ہندوستان میں موجود ہے، پولیٹکل آواز سے بالکل خالی تھی، نصاب تعلیم میں ایسی کوئی کتاب داخل نہ تھی، تاریخ کی کتابیں اگر پڑھائی جاتی تھیں تو تاریخی حیثیت سے نہیں بلکہ فن انشا کے اعتبار سے، طالب العلموں کی سادہ اور مقدس طرز زندگی، دنیوی خواہشوں سے مبرا اور بے غرض شوق کمالات علمی کے سبب جس قدر زیادہ مفید تھا، اسی قدر ان کو معاملات ملکی سے الگ رکھتا تھا، ہم کو تو جرأت نہیں ہو سکتی مگر علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں کہ (گویا ان سب میں ہم سے مختلف ہیں) کہ "ان العلماء من بین البشر ابعد الامم عن السیاسۃ" (۱) یعنی نوع بشر میں عالم لوگ انتظامات ملکی سے بہت دور ہیں۔

ہم نے اس آرٹیکل میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ مدرسوں کے حالات لکھے ہیں مگر ہم بتانا یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی تعلیم کے اندازہ کرنے کا یہ نہایت چھوٹا پیمانہ ہے، درباری علمی فیاضیوں اور ایجادات و صنائع کو مدرسوں کے لحاظ سے بہرحال مقدم ہونا چاہیے، مدرسوں کی کثرت اور عالمگیر رواج نے بھی پرائیویٹ تعلیم کا جواب کی تعداد کو کم نہیں کیا، ۷۸۹ھ میں جبکہ مصر مدرسوں اور دارالعلوم سے معمور تھا، خود مصر کی ایک جامع مسجد میں چالیس سے زائد حلقۂ درس تھے جن میں ہر قسم کے علوم و فنون پڑھائے جاتے تھے۔ (۲)

میں نے اس آرٹیکل میں اس بات سے قصداً پرہیز کیا ہے کہ سلف کے کارنامے زیادہ آب و تاب سے لکھوں، قوم کی آج یہ حالت ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے بھی اس کے چہرے پر نہیں کھلتا، سلف کے مفاخر کا ہم کیا ذکر کر سکتے ہیں، ہم نے جب خود کچھ نہیں کیا تو اس سے کیا حاصل کہ سلف نے بہت کچھ کیا تھا۔

مولف

ترحم کرد حریفان بیش یا کم صحبت ان گفتن "ز دست عصا چہ آید" آخر اے ہم صحبتان گفتن

---

(۱) دیکھو مقدمہ ابن خلدون فصل ... ص ۳۵ (۲) حسن المحاضرہ جلد ثانی ص ۱۹۰

ملا نظام الدین علیہ الرحمہ

بانی درس نظامیہ

آج تمام ہندوستان میں عربی تعلیم کا جو نصاب ہے، وہ نظامیہ کے نام سے مشہور ہے، لیکن یہ سخت تعجب ہے کہ اکثر لوگوں کو معلوم نہیں کہ یہ نصاب کب بنا؟ اور کس نے بنایا؟ حال کی ایک تصنیف میں اس کو نظام الملک وزیر دولت سلجوقیہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، پرانے تعلیم یافتہ اس قدر جانتے ہیں کہ اس کے بانی ملا نظام الدین صاحب لکھنوی ہیں لیکن اس سے زیادہ ان کو بھی واقفیت نہیں۔

ملا نظام الدین صاحب جس رتبہ کے شخص تھے اور خصوصاً اس نصاب کے قائم کرنے سے ان کو جو شہرت حاصل ہوئی، اس کے لحاظ سے میں ایک مدت سے اس بات کا آرزومند تھا کہ ان کے مفصل حالات دریافت کروں، لیکن چونکہ ہمارے ملک میں بیوگرافی (سوانح عمری) لکھنے کا طریقہ بہت کم تھا، اس لیے اس آرزو کے پوری ہونے کی بہت کم امید ہو سکتی تھی، میر غلام علی آزاد نے سبحۃ المرجان میں مختصر طور پر ان کا تذکرہ کیا ہے جو بالکل ناکافی ہے، بڑی تلاش سے ایک رسالہ ہاتھ آیا جو مولانا ولی اللہ صاحب فرنگی محلی (محشی صدرا) کی تصنیف ہے اور خاص ملا صاحب مرحوم کے حالات میں ہے لیکن اس میں اصلی حالات نہایت کم ہیں، البتہ ان کی کرامتوں اور خرق عادات کا ایک بڑا دفتر ہے، جو اس زمانہ کے کام کا نہیں۔

تاہم بمصداق مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ میں ایک مختصر رسالہ کہ ان کی سوانح

مری کا ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

خاندان کا حال: لکھنؤ کے اطراف میں جو مردم خیز بستیاں ہیں، ان میں ایک مشہور قصبہ سہالی ہے جو لکھنؤ سے دس کوس پر ہے، یہاں مسلمانوں کے دو مشہور خاندان آباد تھے، انصاری جو حضرت ابوایوب انصاریؓ کی اولاد سے تھے، عثمانی جو حضرت عثمانؓ کی اولاد سے، ملا صاحب اسی قصبہ کے رہنے والے تھے اور انصاری خاندان سے تھے، ان کے والد ملا قطب الدین بہت بڑے متبحر عالم تھے اور ان کا حلقہ درس تمام مشرقی ممالک کا قبلہ گاہ تھا، عثمانیوں اور انصاریوں میں قدیم سے عداوت چلی آتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن عثمانی ملا صاحب کے گھر پر چڑھ آئے اور ان کو قتل کر کے گھر میں آگ لگا دی۔ یہ واقعہ ۱۱۰۳ھ میں پیش آیا، چونکہ وہ بے گناہ قتل کیے گئے تھے، لوگوں نے ان کو شہید کا لقب دیا، چنانچہ کتب علمیہ میں جہاں ان کا نام آتا ہے اسی لقب کے ساتھ آتا ہے، ملا قطب الدین صاحب کے چار فرزند تھے، بڑے صاحبزادے اس وقت دلی میں عالمگیر بادشاہ کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، شیخ محمد سعید، شیخ محمد اسعد، ملا نظام الدین، محمد رضا، قطب الدین صاحب کی شہادت کے بعد یہ لوگ بے گھر ہوگئے، اس وجہ سے سہالی سے نکل کر لکھنؤ چلے آئے لیکن یہاں رہنے کا کوئی ٹھکانا نہ تھا، سلطنت تیموریہ کے زمانے میں چونکہ علمی قدر دانی کا حوصلہ نہایت وسعت کے ساتھ قائم تھا اور ملک کا ایک ایک جزئی واقعہ دربار شاہی تک پہنچا دیا جاتا تھا، لکھنؤ کے واقعہ نگار نے فوراً دربار کو اطلاع دی اور وہاں سے فرمان صادر ہوا کہ ملا صاحب کے صاحبزادوں کو فرنگی محل کے محلہ میں ایک قصر مکان مع ملحقات متعلقہ عنایت کیا جائے، اطلاع کی تاریخ ۲۰ شعبان ۳۷ جلوس ۱۱۱۰ مطابق ۱۱۰۵ھ اور فرمان صادر ہونے کی تاریخ ۱۱ شوال ۳۸ جلوس ۱۱۱۰ ہے، اس فرمان کی کچھ عبارت ہم آگے نقل کریں گے۔

لکھنؤ میں آباد ہونے کا سبب: ملا نظام الدین صاحب جن کا ہم تذکرہ لکھ رہے

ہیں اس وقت پانزدہ سالہ تھے، اس لیے فرمان میں ان کا نام نہیں بلکہ ان کے دونوں بڑے بھائیوں کا ہے۔ یہ فرمان اب تک اس خاندان میں موجود ہے اور ہم نے ایک دفعہ لکھنؤ میں اس کی زیارت کی تھی، چنانچہ ہم اس کے ضروری الفاظ اس موقع پر درج کرتے ہیں۔ پیشانی پر عالمگیر کی مہر ہے۔

عالمگیر کا فرمان: (اس میں یہ عبارت ہے

"درین وقت میمنت اقتران فرمان والا شان واجب الاذعان صادر شد کہ یک حویلی فرنگی محل با متعلقہ آن واقع بلدہ لکھنؤ متعلق بصوبہ اودھ کہ از اعتماد ولایتی دست بردار شدہ بود بہ شیخ محمد اسعد و محمد سعید پسران ملا قطب الدین شہید حسب الحکم مقرر فرمودیم، باید کہ حکام و عمال و متصدیان مہمات حال و استقبال و کروریان و کرودیان آنرا بنام مشار الیہما معاف و مرفوع القلم دانستہ بہیچ وجہ مزاحم و متعرض نشوند و درین باب سند مجدد نطلبند"

تحریراً … ذیقعدہ سال سی و ہفتم جلوس والا نوشتہ شد

فرمان کی پشت پر جو عبارت ہے اس کا پہلا فقرہ یہ ہے:

"شرح یادداشت واقعہ بتاریخ روز شنبہ ۱۴ شعبان المعظم جلوس والا موافق ۱۱۰۵ھ مطابق … برسالہ صدارت و مشیخت پناہ فضیلت و کمالات دستگاہ مرزا بار مرحمت و احسان صدر رفیع القدر فضل خان و نوبت و قعہ نویسی کمترین بندگان درگاہ خلائق پناہ حسام الدین حسین قلمی میگردد کہ بعرض مقدس و معلی رسید کہ شیخ محمد اسعد و محمد سعید پسران ملا قطب الدین شہید ساکن قصبہ سہالی بسبب شہادت پدر خود قصبۂ مذکور را گذاشتہ جلاوطن گردیدند و کہا مکانے سکونت ندارند الخ"

رہے تھے، اس نے ایرانی علما کا جاہ و جلال دیکھا تھا، ملا صاحب کی طرف اس کا خیال نہ جا سکا، لوگوں سے پوچھا ملا نظام الدین کہاں تشریف رکھتے ہیں، آپ نے فرمایا مولانا کا حال تو میں نہیں جانتا لیکن نظام الدین سہالوی نام ہے، اس نے چند فقہی مسائل پیش کیے کہ اہل حق (یعنی شیعہ مذہب والوں) کے نزدیک اس کا کیا جواب ہے، ملا صاحب نے اس کا منشا سمجھ کر شیعوں کی روایتوں کے مطابق جواب دیا، نہایت پسند کیا اور کہا کہ انھیں سنیوں کو اس ضلالت (سنیوں) کے مذہب کے موافق بیان فرمایئے، ملا صاحب نے سنیوں کی روایتیں بیان کیں۔ وہ عش عش کر گیا اور کہا کہ جس قدر سنا تھا اس سے زیادہ پایا۔

علما کی نسبت عام شکایت ہے کہ علمی مباحثات سے ہمیشہ ان کو فخر اور امتیاز مقصود ہوتا ہے، اور اس لیے وہ کبھی حریف کے مقابلہ میں سکوت اختیار نہیں کرتے، لیکن ملا صاحب اس عیب سے بالکل پاک تھے، ایک دفعہ ایک صاحب ان سے بحث کرنے کے لیے تشریف لائے۔ ملا صاحب نے مسئلہ کی تحقیق بیان فرمائی، انھوں نے اعتراض کیا، ملا صاحب چپ ہو گئے، انھوں نے مشہور کرنا شروع کیا کہ میں نے ملا نظام الدین کو بند کر دیا، ملا صاحب کے تلامذہ کو نا گوار گذرا، اور ایک شاگرد نے جا کر ان صاحب کو زور تقریر سے بالکل ساکت کر دیا، ملا صاحب کو خبر ہوئی تو اس قدر برہم ہوئے کہ اس شاگرد کو حلقہ درس سے الگ کر دیا اور کہا کہ میں ہرگز یہ نہیں پسند کرتا کہ میری وجہ سے کسی شخص کی شہرت اور عزت میں فرق آئے۔

تصنیفات: ملا صاحب کی تصنیفات کثرت سے ہیں، مثلاً شرح مسلم الثبوت، شرح منار، حاشیہ صدرا، حواشی شمس بازغہ، حاشیہ قدیمہ، یہ تمام کتابیں بڑے پایہ کی ہیں اور نہایت دقیق تحقیقات پر مشتمل ہیں، لیکن درحقیقت ملا صاحب کی شہرت ان تصنیفات کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے طریقہ درس کی بدولت ہے، ملا صاحب کے زمانہ میں ہندوستان کے تمام اطراف میں بڑے بڑے علما موجود

تھے اور ہر ایک کی الگ الگ درسگاہ قائم تھی، مثلاً ملا محب اللہ بہاری مصنف سلم و مسلم متوفی ۱۱۱۹ھ، ملا جیون مصنف نور الانوار المتوفی ۱۱۳۰ھ، سید عبد الجلیل بلگرامی استاد غلام علی آزاد المتوفی ۱۱۳۶ھ، میر غلام علی آزاد بلگرامی، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی المتوفی ۱۱۷۶ھ، لیکن ملا صاحب کے حلقۂ درس سے جس رتبے کے فضلا پیدا ہوئے وہ خود ان بزرگوں کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتے تھے، ملا صاحب کے فرزند مولانا عبد العلی کو تمام ملک نے بحر العلوم کا لقب دیا جو آج تک مشہور ہے اور درحقیقت ہندوستان کی خاک سے کوئی شخص اس جامعیت کا شروع اسلام سے آج تک نہیں پیدا ہوا، ملا صاحب کے دوسرے شاگرد ملا کمال اس پایہ کے شخص تھے کہ مولوی حمد اللہ کی شرح سلم آج نصاب تعلیم میں داخل ہے انہیں کے دامن فیض میں پلے تھے، ملا حسن کو بھی ملا صاحب کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔

ملا صاحب کے درس نے اس قدر قبولیت حاصل کی کہ ہندوستان میں جو جو سلسلے ہیں، سلسلہ انہیں کے شاگردوں پر منتہی ہوتے تھے اور لکھنؤ کا فرنگی محل تو علم و فن کا معدن بن گیا، جہاں دو سو برس سے آج تک کبھی سلسلہ منقطع نہیں ہوا اور سیکڑوں اہل کمال پیدا ہوکر تمام ملک میں پھیل گئے، ملا حسن، مولانا ظہور اللہ، مولوی ولی اللہ، مفتی محمد یوسف، مولانا عبد الحلیم، مولانا عبد الحی صاحب مرحوم جو ہمارے زمانہ میں موجود تھے، ان کی تصنیفیں تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہیں، آج جہاں جہاں علوم عربیہ کا نام و نشان باقی ہے، اسی خاندان کا پرتو فیض ہے، ہندوستان کے کسی گوشہ میں جو شخص تحصیل علم کا احرام باندھتا ہے، اس کا رخ فرنگی محل کی طرف ہوتا ہے، میں نے ۱۸۹۶ء میں جب ملا نظام الدین کے مقبرہ کی زیارت کی اور ان کی درسگاہ کو جو ایک مختصر سا دالان ہے دیکھا تو عجیب عبرت ہوئی، اللہ اللہ! ہمارے ہندوستان کا کعبہ یہی ہے، یہی خاک ہے جس سے عبد العلی بحر العلوم اور ملا کمال پیدا ہوئے، افسوس اب یہ کعبہ ویران ہوتا جاتا ہے، اور فرنگی محل میں صرف ایک مقدس بزرگ مولانا نعیم صاحب باقی ہیں، جو عبد العلی بحر العلوم

کے پر پوتے ہیں اور جن کو ہماری سرکار نے شمس العلما کا خطاب دیا ہے۔

درس نظامیہ کے خصوصیات: ملا صاحب کے حالات میں سب سے زیادہ قابل توجہ ان کا مقرر کردہ نصاب ہے، جو نظامیہ کے نام سے مشہور ہے، اس نصاب کے خصوصیات یہ ہیں:

(۱) نصاب میں ہندوستان کے علما کی متعدد کتابیں داخل ہیں مثلاً نور الانوار، سلم، مسلم، رشیدیہ، شمس بازغہ، حالانکہ اس سے پہلے یہاں کی ایک تصنیف بھی درس میں داخل نہ تھی۔

(۲) ہر فن کی دو کتابیں لی ہیں جن سے زیادہ مشکل اس فن میں کوئی کتاب نہ تھی۔

(۳) منطق و فلسفہ کی کتابیں تمام علوم کی نسبت زیادہ ہیں۔

(۴) حدیث کی صرف ایک کتاب ہے یعنی مشکوٰۃ

(۵) ادب کا حصہ بہت کم ہے۔

اس نصاب میں سب سے زیادہ مقدم خصوصیت جو ملا صاحب کو پیش نظر تھی یہ تھی کہ قوت مطالعہ اس قدر قوی ہو جائے کہ نصاب کے ختم کرنے کے بعد طالب علم جس فن کی جو کتاب چاہے سمجھ سکے، اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ درس نظامیہ کی کتابیں اگر اچھی طرح سمجھ کر پڑھ لی جائیں تو عربی زبان کی کوئی کتاب لاینحل نہیں رہ سکتی، بخلاف درس قدیم کے کہ اس سے یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

اختصار کے لحاظ سے بھی اس نصاب کو نصاب قدیم پر ترجیح ہے، ایک متوسط الذہن طالب العلم سولہ سترہ برس کی عمر میں تمام کتب درسیہ سے فارغ ہو سکتا ہے، چنانچہ علمائے فرنگی محل میں اکثر اتنی ہی عمر میں فارغ ہو جاتے تھے۔

اس نصاب کی بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ چونکہ اس میں نقلی کتابیں بہت کم ہیں اور جو ہیں ان میں معقولی استدلال سے کام لیا گیا ہے، اس لیے اس نصاب

سے وہ تقشف اور ظاہر پرستی اور مذہب کا بیجا تعصب نہیں پیدا ہوتا تھا جو عموماً فقہا کا خاصہ ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ فرنگی محل میں جو بڑے بڑے علما پیدا ہوئے ان میں کسی نے مذہبی مناظرات کی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ شیعہ و سنی کا جھگڑا سب سے زیادہ لکھنؤ میں پیدا ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ صدا وہیں سے بلند ہوئی اور گو تمام ملک اس ہنگامہ میں مبتلا ہو گیا اور تحفہ اثنا عشریہ کے فقرے ہر جزو کی طرح مذہبی پہلوانوں کی زبانوں پر چڑھ گئے۔ تاہم علمائے فرنگی محل اخیر تک اس شورش سے الگ رہے۔ اس انصاف سے اور باتوں کے مولانا نظام الدین صاحب کی انصاف پرستی اور فراخ حوصلگی کا بڑا ثبوت ملتا ہے۔ علما میں یہ خصلت بہت کم پائی جاتی ہے کہ ان کو معاصرین کے فضل و کمال کا اقرار ہو۔ لیکن ملا صاحب نے اپنے معاصر علما کی اس قدر عزت کی کہ ان کی کتابیں درس میں داخل کر دیں۔ نور الانوار، سلم و مسلم سب ان کے معاصرین کی تصنیفات ہیں اور درس نظامیہ میں داخل ہیں۔ ملا صاحب کی کسر نفسی اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ اپنی کوئی تصنیف نصاب میں داخل نہیں کی حالانکہ ان کا کوئی معاصر ان کی ہمسری نہیں کر سکتا۔

اس موقع پر یہ بتا دینا بھی ضرور ہے کہ موجودہ درس جو نظامیہ کے نام سے مشہور ہے دراصل درس نظامیہ نہیں ہے۔ اس میں بہت سی کتابیں ایسی اضافہ ہو گئیں ہیں جو ملا نظام الدین صاحب کے عہد میں موجود بھی نہ تھیں مثلاً ملا حسن، حمد اللہ، حاشیہ غلام یحییٰ، قاضی مبارک۔ اگرچہ ہمارے نزدیک ضروریات زمانہ کے لحاظ سے درس نظامیہ میں بہت کچھ ترمیم و اضافہ کی ضرورت ہے۔ لیکن اس مضمون میں ہم اس بحث کو نہیں چھیڑتے اور اسی تحریر پر بس کرتے ہیں۔

(معارف علی گڑھ فروری ۱۹۰۰ء)

درس نظامیہ (۱)

فرنگی محل یا نظامیہ بغداد یا ہندوستان کا کیمبرج

ہماری قدیم طرز تعلیم اور آج کل کی مغربی تعلیم میں اس قدر فرق ہے کہ چند روز کے بعد لوگوں کو قدیم تعلیم کی صحیح تصویر ذہن نشین کرانی مشکل ہوگی، جس طرح آج سلطنت تیموریہ کے اصول حکومت اور طریقۂ انتظام کا خاکہ لوگوں کے ذہن میں نہیں آتا، ایک شاندار عظیم الشان عمارت، پروفیسروں کا ایک گروہ، لکچروں کا ایک مسلسل، چند محدود گھنٹے (جس کے بعد وہ عمارت قریب بے جان رہ جاتی ہے) یہ چیزیں یکجا ہو جائیں تو یہ ایک یونیورسٹی یا کالج ہے، لیکن قدیم اصطلاح میں کالج ایک شخص کے وجود خاص کا نام تھا، وہ جہاں بیٹھ جاتا تھا کالج بن جاتا تھا، اس کے گرد مستفیدوں کی ایک جماعت نیز جمع ہو جاتی تھی، اس کے فیض کا بادل ہر وقت برستا رہتا تھا، دن رات جس وقت جو کچھ بولتا تھا سب لکچر ہوتا تھا، اس کے حرکات و سکنات، نشست برخاست، وضع قطع، طور طریقے سب خاموش عملی لکچر تھے، شاگردوں کا سلسلہ

(۱) اس مضمون کی ماخذ حسب ذیل کتابیں ہیں (۱) رسالہ قطبیہ و مناقب ملا قطب الدین شہید از ملا عبد الاعلیٰ فرزند مولوی عبد العلی بحر العلوم (۲) الاغصان الاربعہ مولوی ولی اللہ محشی صدرا (۳) عمدۃ الوسائل مولوی ولی اللہ صاحب موصوف اسماء رجال ملا قطب الدین و شاہ عبد الرزاق بانسوی (۴) انصاف الانساب مصنفہ رضی الدین محمود انصاری تصنیف ۱۲۱۰ ہجری، اس موقع پر مجھ کو جناب مولوی عبد الباری کا شکریہ ادا کرنا بھی فرض ہے جنہوں نے یہ کتابیں مجھ کو دیکھنے کے لیے عنایت کیں۔

معاش داشتند و مساجد و مدارس و خانقاہات بنا نہادہ و مدرسان عصر در ہر جا ابواب علم بروے دانش پژوہان کشادہ و طلبۂ علم خیل خیل میر وند و ہر جا موافقت دست بہم دادہ بہ تحصیل مشغول میشوند و صاحب توفیقان بر معمورہ طلبۂ علم را نگاہ میداشتند و خدمت ایں جماعہ را سعادتِ عظمیٰ میدانستند صاحب قران ثانی شاہ جہاں انار اللہ برہانہ می گفت پورب شیراز مملکت ماست" (۱)

یہ نظام ۱۱۴۰ھ تک قائم رہا، جب برہان الملک سعادت خان نیشاپوری اودھ کے صوبہ دار ہوئے تو تمام معافیاں ضبط کر لیں، علماء فضلا کی اولاد کسب معاش کی ضرورت سے جو جہاں جا تا تجویز کرتے کرتی تھی مصروف ہوئی، مدد سے ویران ہو گئے اور علمی صحبتیں درہم برہم ہو گئیں۔ ۱۱۵۹ھ میں الہ آباد کا صوبہ بھی اس خاندان کے قبضہ میں آ گیا اور صفدر جنگ صوبہ دار مقرر ہوئے، انھوں نے رہی سہی معافیاں بھی ضبط کر لیں۔ محمد شاہ کے زمانہ میں صفدر جنگ کو وزارت ملی، ان کے نائب وظیفہ داروں کو اور بھی زیادہ تنگ پکڑا اور اس طرح وہ تمام علمی بستیاں اجڑ گئیں۔ (۲)

غرض انھیں زندہ دلوں میں ایک سہالی بھی تھی، جس نے آگے چل کر فرنگی محل کا قالب اختیار کیا، یہ لکھنؤ سے ۲۲ میل پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو کسی زمانہ میں بہت بڑا قصبہ تھا، درس نظامیہ کا سنگ بنیاد اسی سرزمین پر رکھا گیا۔

درس نظامیہ ہندوستان کی علمی تاریخ اور علمی زبان کا سب سے زیادہ نمایاں لفظ ہے، ہندوستان میں آج کلکتہ سے پشاور تک جس قدر تعلیمی سلسلے پھیلے ہوئے ہیں سب اسی درس کی شاخیں ہیں، کوئی عالم عالم نہیں مانا جا سکتا جب تک ثابت نہ ہو کہ اس نے اسی طریقہ درس کے موافق تعلیم حاصل کی ہے، جس طرح کھوٹا سکہ ٹکسال باہر کہلاتا ہے، اسی طرح کسی کتاب کا درس نظامیہ سے خارج ہونا اس بات کی شہادت

---

(۱) کتاب تذکرہ مولانا نظام الدین (۲) یہ پوری تفصیل آثر الکرام میں ہے۔

ہے کہ وہ نصاب تعلیم میں داخل ہونے کی ترجیح کا دعویٰ نہیں کر سکتی، درس نظامیہ
اگرچہ خاص ہندوستان کا کارنامہ ہے۔ لیکن نظام الملک نے بغداد میں جو مدرسۂ اعظم
نظامیہ کے نام سے قائم کیا تھا اس کی عالمگیر شہرت نے اس قدر وسعت دراز کی کہ
اس سلسلہ کو بھی اس کے فہرست اعمال میں داخل کرنا چاہا، چنانچہ ہمارے زمانہ کے
آخر تک یہ اتفاقی دھوکہ ہو گیا، یہاں تک کہ ایک اردو تصنیف میں بصراحت یہ دعویٰ کیا گیا۔

درس نظامیہ اگرچہ ملا نظام الدین صاحب کی طرف منسوب ہے لیکن
درحقیقت اس کی تاریخ ایک پشت اوپر سے شروع ہوتی ہے یعنی ملا نظام الدین کے
والد سے جن کا نام ملا قطب الدین شہید تھا اور اس لیے اس علمی لوح کے طغرا وہی قرار
پا سکتے ہیں، تمام ہندوستان میں بلکہ انصاف یہ ہے کہ تمام دنیائے اسلام میں یہ بات
صرف اسی مقدس ذات کو حاصل ہے کہ دو سو برس تک متواتر اور بلا فصل ان کی
نسل سے علما ہوتے چلے آئے اور آج بھی یہ سلسلہ قائم ہے، ہندوستان کی علمی تاریخ
میں یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ اس ملک میں تاریخ اور رجال کا مذاق کم تھا لیکن
اس سلسلے نے جس اپنے خاندان کا حال اس استقصا کے ساتھ لکھا کہ اس کی نظیر نہیں
مل سکتی، چنانچہ ہم کو اس مضمون کے لکھنے میں تاریخی معلومات کی حیثیت سے کوئی دقت
نہیں پیش آئی۔

اسلام جب عرب سے نکل کر دور دور ممالک میں پھیلا تو اکثر عرب کے
خاندان ہجرت کر کے ان ممالک میں چلے آئے۔ ان میں سے حضرت ابو ایوب انصاریؓ
کی نسل سے ایک بزرگ ہرات میں آئے اور یہاں سکونت کی۔ اسی کے خاندان سے
ایک بزرگ علاء الدین انصاری (۱) ہندوستان آئے۔ چنانچہ ان کا مزار قصبہ برناوہ
میں ہے جو دہلی اور میرٹھ کی راہ میں واقع ہے۔ انہی کی نسل سے شیخ نظام الدین سہالی میں

(۱) یہ تین بھائی ہمراہ آئے تھے ایک نے ان میں سے پانی پت میں قیام کیا چنانچہ پانی پت کے انصاری
انہی کے خاندان میں سے ہیں۔ رسالہ قطبیہ کہ میں یہ سلسلہ نانہالی اور ... سے لڑکی کی طرف سے ہے۔

آئے، شیخ موصوف نے یہاں مستقل سکونت اختیار کی اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔

شیخ نظام الدین کے پر پوتے شیخ حافظ نے علم و فضل میں زیادہ شہرت حاصل کی، یہ شہنشاہ اکبر کا زمانہ تھا، تیموری حکومت کی یہ خصوصیت اس کے کارناموں کا طغرائے زریں ہے کہ تمام ملک میں چپہ چپہ پر واقعہ نویس موجود تھے، جن کے متعلق یہ خدمت بھی تھی کہ ارباب کمال کے وجود سے بادشاہ کو اطلاع دیتے رہتے تھے، چنانچہ خبر ہونے کے ساتھ ان لوگوں کی جاگیریں مقرر ہو جاتی تھیں، جن کی مال گذاری ان کے لیے معاف ہو جاتی تھی، اس قسم کے بے شمار فرامین شاہی خود ہماری نظر سے گذرے ہیں، غرض شیخ حافظ کی بھی جاگیر مقرر ہوئی اور اس کے متعلق فرمان شاہی عطا ہوا، یہ فرمان اب تک اس خاندان میں موجود ہے اور اس میں (جیسا کہ مولوی ولی اللہ صاحب نے اغصان اربعہ میں لکھا ہے) شیخ کی نسبت نہایت تعظیمی الفاظ مذکور ہیں، شیخ موصوف کی درسگاہ میں طلبہ کی سکونت کا انتظام تھا، جن کے مصارف کا تکفل خود شیخ کی طرف سے کیا جاتا تھا۔

ملا قطب الدین شہید انہیں شیخ حافظ کی نسل سے چوتھی پشت میں تھے، درس نظامیہ کی اصلی بنیاد انہیں سے شروع ہوئی ہے۔ ملا صاحب کے والد لاہور کے مدرسہ میں مدرس تھے، ملا صاحب نے اسی زمانہ میں ان سے تعلیم پائی، ان کے علاوہ قاضی گھاسی سے علوم حاصل کیے جو بہت بڑے صوفی اور حضرت محب اللہ الہ آبادی کے خلیفہ اور جانشین تھے، اس زمانہ میں قصبہ دیوہ جو لکھنؤ کے نواح میں ہے مولانا عبدالسلام کے درس کی وجہ سے علم و فضل کا مرکز تھا، ملا صاحب نے وہاں بھی جا کر علم کی تحصیل کی، مولانا عبدالعلی بحرالعلوم کے خلف اکبر مولوی عبدالاعلی اپنے رسالہ قطبیہ میں لکھتے ہیں کہ ان کی تصنیفات میں سے صرف شرح حکمۃ العین کا حاشیہ اور رسالہ امور عامہ کے مسودے کے کچھ جزء میرے والد کے کتب خانہ میں موجود ہیں، تلویح کا حاشیہ بھی

ملا نظام الدین کے زمانہ تک موجود تھا مگر اب مفقود ہے۔"

ملا صاحب کا معمول یہ تھا کہ دن کو درس دیتے تھے، شب کو عبادت میں مصروف ہوتے تھے اور سہ شنبہ اور جمعہ کے دن تصنیف کرتے تھے۔ (۱)

ملا صاحب کے فضل و کمال کا شہرہ ہوا تو عالمگیر نے ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، لیکن ملا صاحب نے اپنے اسلاف کے طریقہ کے موافق گوشۂ عزلت کا چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ (۲)

ملا صاحب نے درس کا ایک خاص طریقہ اختیار کیا تھا جو خود ان کا قائم کردہ تھا، وہ ہر فن کی صرف ایک جامع اور مستند کتاب پڑھاتے تھے کہ شاگرد کو تمام مسائل پر مجتہدانہ عبور ہو جاتا تھا۔ رسالہ قطبیہ میں ہے:

"مولانا شہید (ملا قطب الدین) از ہر فن یک یک کتاب بخوانید و خوش کردانا محقق می شدند"

ملا نظام الدین اور مولانا بحر العلوم نے اس پر اضافہ کیا، چنانچہ تفصیل آگے آتی ہے۔

ملا صاحب کے حلقۂ درس نے نہایت وسعت حاصل کی اور سلسلۂ تلامذہ میں ایسے علما پیدا ہوئے جن کے الگ الگ حلقۂ درس ہو گئے اور تمام ہندوستان پر چھا گئے، ان میں سے چار شخص نہایت نامور ہیں، ملا نظام الدین جن کے نام سے درس نظامیہ مشہور ہے، ملا محب اللہ بہاری جو بیک واسطہ ملا صاحب کے شاگرد ہیں اور جن کی تصنیف سلم اور مسلم اس قدر مقبول ہوئی کہ آج علما کا سرمایۂ کمال یہی کتابیں اور ان کی شرحیں ہیں، مولوی امان اللہ بنارسی جو ملا نظام الدین کے استاد تھے اور جن کی اصول فقہ میں ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے، قطب الدین شمس آبادی جو ملا محب اللہ بہاری کے استاد تھے۔

---

(۱) رسالۂ قطبیہ از مولانا عبد الاعلیٰ برحاشی ملا قطب الدین شہید (۲) گلزار اعظم

همراه گرفته، و نعش مولوی و سر محمد آصف چودھری نیز با خود بموضع مذکور بردند، بعد از سه چهار روز از الحاح و عجز بعضے شرفائے فتحپور بیوا جنده نظام الدین را خلاص نمودند، و سر محمد آصف وا نعش مولوی را جا بجا مدفون ساختند و ثانی برآوردند، آخر بعد سه روز سر او دست بریده گرفته و نعش به قصبہ سہالی فرستادند، چنانچہ جمع از مسلمین نماز جنازہ خواندہ بتاریخ بست و نہم شہر مذکور در قصبہ سہالی مدفون ساختند"۔

تذکروں میں دشمنوں کی مخالفت کی کوئی خاص وجہ ملا صاحب سے نہیں لکھی ہے اور صرف آصف چودھری کی پیہ گزینی ایسی بے رحمی اور سفاکی کا سبب نہیں ہو سکتی، عمدۃ الوسائل میں لکھا ہے کہ یہ شخص اپنی زمینداری میں نہایت ظلم کرتے تھے اور چونکہ عالمگیر ملا قطب الدین سے نہایت راہ و رسم رکھتا تھا اور امرائے دربار کو ان کی خدمت میں بھیجتا رہتا تھا، اس لیے انھوں نے سمجھا کہ ہمارے مظالم بادشاہ تک پہنچ جائیں گے ملا سعید یہ خبر سن کر تظلم کے لیے دکن گئے، عالمگیر نے عمال کے نام فرمان بھیجا کہ قاتلوں سے قصاص لیا جائے اور ان کا خان و مان برباد کر دیا جائے (۱) چنانچہ صوبہ دار لکھنؤ نے سرکاری سپاہ بھیج کر ان کا گھربار غارت کر دیا، مخالفین بھاگ کر جلاوطن ہو گئے اور بالآخر خاندان والوں نے جعلی فوتی نامہ بنا کر عالمگیر کے دربار میں پیش کیا کہ قاتل مر گئے، اصل قاتل اسعد اللہ تھا، جو موضع سندی پور کا رہنے والا تھا وہ گور دلوش ہو کر بچ گیا، لیکن مدت تک زندہ رہا، چنانچہ ملا نظام الدین (پسر ملا قطب الدین شہید) کی خدمت میں حاضر ہوا گرچہ تھا، اس نے ملا صاحب کی خدمت میں خون بہا بھی پیش کیا لیکن انھوں نے قبول کرنے سے انکار کیا بلکہ اپنا حصہ معاف کر دیا، تاہم خون کا یہ اثر تھا کہ جب وہ ملا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا تو آپ اس کی طرف سے منہ پھیر لیتے تھے (۲) مولوی ولی اللہ صاحب عمدۃ الوسائل میں لکھتے ہیں کہ میں نے ۱۲۰۹ھ میں سندی پور جا کر دیکھا تو ویران اور تباہ تھا اور گاؤں والے کہتے تھے کہ یہ اسی

(۱) انتصاحات اربعہ مطبوعہ مطبع نظامی لکھنؤ (۲) رسالہ قطبیہ

ملا جیائی تک پڑھ چکے تھے، لکھنؤ میں آ کر طالب العلمی میں مشغول ہوئے، ابتدائی کتابیں دیواں جا کر پڑھیں جو آج حاجی وارث علی صاحب مرحوم کے انتساب سے مشہور ہے اور اس زمانہ میں مولانا عبدالسلام کا درس گاہ تھا پھر اکثر کتابیں جائس میں جا کر ملا علی قلی سے پڑھیں، امور عامہ مولانا امان اللہ بنارسی سے پڑھا، توضیح کی تحصیل ملا نقشبند گورکھپوری سے کی (۱) مولوی غلام علی آزاد سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں کہ آخری کتابیں ملا غلام علی نقشبندی سے لکھنؤ میں پڑھیں، زمانہ کا انقلاب دیکھو آج جائس اور دیوا معمولی دیہات ہیں، ایک زمانہ تھا کہ وہ ملا نظام الدین کے قبلۂ مقصد تھے، غرض ملا صاحب نے ۲۳ برس کی عمر میں تمام علوم و فنون سے فراغت حاصل کی۔

سلسلۂ قطبیہ میں یوں تو سیکڑوں علما پیدا ہوگئے لیکن ملا نظام الدین کے نام کو خدا نے وہ عزت دی کہ آج سب کا نام انھیں کے نام سے روشن ہے اور ہندوستان کا تمام سلسلۂ درس انھیں کے نام سے منسوب ہے، مولوی غلام علی آزاد آثر الکرام میں لکھتے ہیں "امروز علمائے اکثر قطر ہندوستان نسبت تلمذ بہ مولوی دارند و کلاہ گوشۂ تفاخری شکنند و کسیکہ سلسلۂ تلمذ بہ او رساند بین الفضلا بعلم امتیازی افرازد" وہ علم و فضل کے ساتھ زہد و قناعت، صبر و رضا، تقدس اور ایثار نفس کے وغیرہ مجسم تھے، ان کی تصنیفات بھی کثرت سے ہیں لیکن یہ بھی ان کا ایثار نفس ہے کہ سلسلۂ درس میں اپنی ایک تصنیف بھی شامل نہیں رکھی، بلکہ اپنے استاد بھائی ملا محب اللہ بہاری کی کتابیں سلم و مسلم درس میں داخل کیں جس کی بدولت آج ان کتابوں کا نام آفتاب و ماہتاب کی طرح روشن ہے۔

ملا صاحب نے چالیس برس کی عمر میں شاہ عبدالرزاق بانسوی کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر تصوف کا رنگ ان پر غالب آگیا، ملا صاحب کا بالا خانہ جس پر بیٹھ کر درس دیا کرتے تھے آج بھی موجود ہے، میں نے ۱۸۹۹ء میں اس کی زیارت کی تھی، ۹ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۸ھ میں سنگ مثانہ کی بیماری میں وفات پائی۔

---

(۱) یہ تفصیل اغصان الانساب میں ہے۔

عبدالباسط امیٹھوی نے تاریخ لکھی

نظام الدین محمد باصل حق چو از روے زمین سوے فلک شد
وصال سال تاریخش فلک گفت فلک بود و بیک حرکت ملک شد(۱)

تصنیفات حسب ذیل ہیں:

شرح منار، حاشیہ شمس بازغہ، حاشیہ حاشیہ قدیمہ، شرح عقائد دوانیہ، شرح مسلم، شرح تحریر الاصول، حاشیہ صدرا۔

ملا صاحب نے نہایت زہد وقناعت کی زندگی بسر کی، کبھی کبھی تین تین دن کا فاقہ گذر جاتا تھا، اکثر چنے چاب کر رہ جاتے تھے، کبھی اہل دنیا کی طرف توجہ نہ کی، مناظرہ ومجادلہ جو علما کا عام طریقہ ہے، اس سے پرہیز کرتے تھے، ان کے طلبہ میں اگر کوئی کسی کو بحث میں الزام دیتا تھا تو اس سے ناراض ہوتے تھے، چونکہ میں نے ملا صاحب کا حال معارف میں تفصیل سے لکھا ہے، اس لیے یہاں مختصراً ذکر کرتا ہوں۔

مولانا عبدالعلی بحر العلوم: ملا صاحب کی پہلی شادی سے کوئی اولاد نہ تھی، لوگ کہتے تھے کہ دوسری شادی کیجیے، فرماتے تھے کہ میں جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا، ہاں کسی بزرگ کا ارشاد ہو تو مجبوری ہے، میر اسماعیل بلگرامی سے ملا صاحب نے فیض باطنی حاصل کیا تھا، انھوں نے کہلا بھیجا کہ مجھ کو الہام سے معلوم ہوا کہ دوسری شادی سے تمہارے اولاد ہوگی، غرض آخر عمر میں قصبہ سترکھ میں شادی کی، جس سے وہ گوہر شاہوار پیدا ہوا جو آج بحر العلوم کے نام سے مشہور ہے۔

بحر العلوم نے جن کا اصلی نام عبدالعلی ہے، تمام کتابیں ملا صاحب ہی سے پڑھیں، اس وقت ان کا سن ۱۴ سال کا تھا، اسی زمانہ میں ملا صاحب نے ان کی شادی قصبہ کاکوری میں کر دی، ملا صاحب کی وفات کے بعد بحر العلوم نے ملا کمال سے استفادہ کیا جو ملا نظام الدین کے شاگردوں میں سب سے ممتاز تھے۔

آغاز شباب تھا کہ ایک ناگوار واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے ان کو وطن چھوڑنا

---

(۱) رسالہ عمدۃ الوسائل میں نقل کی ہے اور شاعر کا نام قربان اللہ صاحب نے لکھا ہے۔

حافظ رحمت خان نے مولانا کے مصارف کے لیے معقول رقم مقرر کر دی اور ان کے طلبہ کے وظائف مقرر کرا دیے۔ نواب عبداللہ خان رئیس شاہجہاں پور نے قلعہ میں لے جا کر اپنے مکان میں اتارا۔ دور دور سے طلبہ مولانا کا نام سن کر آنے لگے اور بہت بڑی درس گاہ قائم ہو گئی۔ بہت سے لوگ فارغ التحصیل ہو کر نکلے، یہاں مولانا نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ حافظ رحمت خان نے جب شہادت پائی تو یہ اطراف نواب شجاع الدولہ کی حکومت میں آ گئے تو مولانا نے یہاں سے نکلنے کا ارادہ کیا، اس زمانہ میں رامپور کی ریاست پر نواب فیض اللہ خان حکمراں تھے، وہ خود جا کر مولانا کو ساتھ لے گئے، چند روز تک مولانا نے یہاں قیام کیا لیکن نواب موصوف مولانا کے گروہ طلبہ کی کفالت نہ کر سکے اور مولانا نے یہاں سے بھی نکلنے کا ارادہ کیا۔ اس زمانہ میں منشی صدر الدین خان نے بوہار میں جو کلکتہ کے نواح میں ہے ایک مدرسہ قائم کیا تھا، مولانا کے پاس زاد راہ بھیج کر تشریف لانے کی درخواست کی، مولانا سو شاگردوں کے ساتھ بوہار کو روانہ ہوئے، قریب پہنچے تو منشی صدر الدین خان خود استقبال کر کے لائے۔ پھر سو تنخواہ مقرر کی اور مولانا کے تمام شاگردوں کے وظائف مقرر کر دیے۔

یہ واقعات اغصان اربعہ سے منقول ہے لیکن رسالہ قطبیہ میں ہے کہ مولانا کو رامپور میں کچھ شکایت کی وجہ نہیں پیدا ہوئی تھی، لیکن منشی صدر الدین خان کے سخت اصرار کی وجہ سے مجبور ہو گئے، قطبیہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ منشی صدر الدین خان نے افسران انگریزی کی سفارشیں بھی نواب فیض اللہ خان کے پاس بھجوائیں کہ وہ مولانا کو اجازت روانہ کر دیں۔

بہر حال مولانا نے بوہار میں کچھ زمانہ تک قیام کیا، یہ وہ زمانہ ہے کہ مدراس میں نواب والا جاہ محمد علی خان والی ارکاٹ کی حکومت تھی، وہ خاص قصبہ گوپامئو کے رہنے والے تھے، اس تعلق سے مولانا کے ہم وطن تھے، مولانا بعض اسباب کی وجہ

سے بوہار سے دل برداشتہ ہو گئے تھے، یہ خبر نواب کو پہنچی، فوراً درخواست بھیجی، مولانا بوہار سے روانہ ہوئے، مدراس کے قریب پہنچے تو نواب نے اعزہ خاندان اور امرائے دربار کو ایک منزل آگے استقبال کے لیے بھیجا، شہر میں داخل ہوئے تو سب امراء جلو میں ساتھ ساتھ تھے، ڈیوڑھی کے قریب پالکی پہنچی تو نواب مع تمام متعلقین کے پیادہ نکلا، مولانا نے پالکی سے اترنا چاہا، نواب نے دوڑ کر پالکی میں کاندھا دیا اور اسی طرح مکان کے صحن تک رہا، دربار میں جہاں خود اس کی نشست تھی مولانا کو اسی جگہ بٹھایا اور مولانا کے قدم چومے اور کہا کہ یہ نصیب کہاں تھے کہ حضور کا قدم میرے گھر میں آتا۔ (۱)

انصاف الانساب میں لکھا ہے کہ مولانا بوہار سے اٹھ کر پہلے کلکتہ میں آئے، یہاں نظام حیدرآباد اور سلطان حیدر (ٹیپو سلطان کا باپ) کی متعدد عرضیاں آئیں کہ یہاں قدم رنجہ فرمایئے لیکن چونکہ ہم وطنی کا واسطہ تھا اس لیے مولانا نے مدراس کو ترجیح دی۔

نواب محمد علی خان نے مولانا کو ایک نہایت عمدہ محل رہنے کو دیا اور روزانہ اپنے باورچی خانہ سے کھانا بھجواتا تھا، جب کبھی مولانا اس کے ملنے کو جاتے تھے تو اسی پہلے دستور کے موافق استقبال اور تعظیم کرتا، چند روز کے بعد ایک بڑا مدرسہ تعمیر کرایا، مولانا کی پیش قرار تنخواہ مقرر کی، طلبہ کے وظیفے مقرر کیے، مولانا اب اسی مدرسے میں طلبہ کے ساتھ رہنے لگے۔

نواب محمد علی خان کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے عمدۃ الامراء مسند نشین ہوئے، خاندان میں مسند نشینی کے متعلق نزاع کا احتمال تھا لیکن مولانا نے جب ان کو لے جا کر مسند پر بٹھایا تو سب نے گردن اطاعت خم کر دی، عمدۃ الامراء نے باپ سے بھی زیادہ عزت و حرمت کی، مولانا کے علاوہ ان کے خاندان کے لیے ایک ماہوار

(۱) یہ پوری تفصیل انصاف الانساب میں ہے۔

مقرر کئے۔ عمدۃ الامرا کے مرنے کے بعد لوگوں نے ان کے بیٹے کو مسند نشین کیا لیکن
چونکہ مولانا اس کے عقائد اور مذہب کی طرف سے مطمئن نہ تھے، خود اس رسم میں
شریک نہ ہوئے، چونکہ اس نے اپنی خاندان کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا، لوگوں نے
شکایت کی، بالآخر چھ مہینے کے بعد انگریزوں نے اس کو معزول کر دیا اور عظیم الدولہ
کو جو نواب محمد علی خان کے بڑے بیٹے تھے مسند نشین کیا، عظیم الدولہ مولانا کے
شاگرد خاص تھے، عظیم الدولہ کی نوابی برائے نام تھی، کیونکہ گورنمنٹ انگریزی نے ملک
اس کے قبضہ سے نکال کر روزینہ مقرر کر دیا تھا، لیکن عظیم الدولہ نے مولانا کی ماہوار
جاری رکھی۔

اب مولانا کی عمر ۸۳ برس کی ہو چکی تھی اور ضعف غالب آتا جاتا تھا، یہاں
تک کہ ۸ رجب ۱۲۳۵ھ میں مرض الموت میں گرفتار ہوئے، چار دن تک یہ حالت
رہی کہ کبھی کبھی ہوش آجاتا تھا، پھر غشی طاری ہو جاتی تھی، ہوش کی حالت میں چند بار
فرمایا کہ نفی و اثبات کی حقیقت اب معلوم ہوئی۔ خدا کے سوا کوئی چیز موجود نہیں،
۱۲ رجب کو انتقال کیا۔ (۱)

مولانا کے اخلاق و عادات کی سب سے نمایاں صفت فیاضی اور دریا دلی تھی
ہمیشہ نہایت فارغ البال رہے لیکن جو کچھ آتا تھا احباب اور فقرا کو تقسیم کر دیتے تھے،
اس وجہ سے اہل و عیال نہایت تنگی سے بسر کرتے تھے، لکھنؤ سے بار بار اپنی عسرت اور
تنگ حالی کی شکایت لکھتے تھے لیکن مولانا کچھ خیال نہیں کرتے تھے، کبھی کبھی نواب کو
خبر ہو جاتی تھی تو وہ براہ راست بھیج دیتا تھا۔

مزاج میں اپنے والد کے خلاف انبساط اور تمکنت تھی، کسی سے دبتے نہ تھے،
مناظرہ کے بہت شائق تھے، ان سے زیادہ وسائل کے جو علما تھے ان سے مباحثے
کرتے تھے، لکھنؤ میں جب شیعوں نے ان کے مقابلہ میں غلو کرنا چاہا تو ایک گروہ کثیر

---

(۱) قصاصان ادب

ساتھ لے کر مقابل ہوئے اور آخر حریف کو بھاگ جانا پڑا، تصنیفات میں بھی اس انداز طبیعت کی جھلک نظر آتی ہے۔

مولانا کے تین صاحبزادے تھے، ان کے حالات تفصیل سے لکھے جا سکتے ہیں لیکن یہ مضمون ایک کتاب بن جائے گی۔

سلسلہ نظامیہ کی علمی حالت پر ایک عام اجمالی نظر: اس خاندان نے علم و فن کے ترقی دینے میں جو جو کام کیے ان کی تفصیل کے لیے ایک دفتر درکار ہے، میں مختصراً بعض اہم باتیں لکھتا ہوں۔

۱- سب سے پہلے یہ کہ اتفاق سے یہ خاندان کثیر الافراد تھا، ملا قطب الدین شہید کے چار صاحبزادے تھے، ان سب سے خاندان پھیلا اور بیحد کثرت اولاد رہی، مولوی عبدالباری صاحب نے ایک رسالہ آثار الاول نام لکھا ہے جو شائع ہو چکا ہے، وہ گویا اسی خاندان کی انسائیکلوپیڈیا ہے، اس میں سیکڑوں بزرگوں کے نام اور مختصر حالات لکھے ہیں، ان بزرگوں میں اکثر صاحب علم اور صاحب تصنیفات تھے، یہاں تک کہ اگر ان سب کی تصنیفات جمع کی جائیں تو ایک کتب خانہ بن جائے گا، میرے زمانہ تک جو مشاہیر زندہ تھے ان کے یہ نام ہیں: مولانا مفتی محمد یوسف، مولانا نعمت اللہ ریاضی داں، مولانا عبدالحلیم، مولانا محمد نعیم، مولانا عبدالحی، مولوی فضل اللہ، ان بزرگوں کے تلامذہ سیکڑوں اور ہزاروں سے متجاوز تھے، جن میں بہت سے خود بڑے بڑے سلسلۂ درس کے مالک تھے، خاکسار کو بھی اسی سلسلہ شاگردی کا فخر حاصل ہے۔

ہندوستان میں جس قدر اور جہاں جہاں بڑے بڑے سلسلۂ درس قائم ہوئے اکثر اسی خاندان کا فیض ہے، مثلاً پورب میں محب اللہ بہاری اور قاسم کی بہاری سے علم پھیلا، دونوں اسی خاندان کے شاگرد تھے، رامپور میں ایک زمانہ تک درسگاہ عام تھا، یہ مولانا بحر العلوم اور ملا حسن کا فیض تھا، کیونکہ یہ دونوں بزرگ ایک مدت تک یہاں رہے تھے اور ملا حسن نے رامپور ہی میں وفات پائی، نجیب الدولہ نے دارانگر

ملا محب اللہ نے اس میں فلسفہ کے مسائل ملا دیے اور اس کا عام انداز بدل دیا۔ یہ کتاب ملا نظام الدین صاحب نے درس میں داخل کی پھر ملا صاحب کے شاگردوں نے اس پر شرحیں لکھیں اور ان میں فلسفہ کا اور زیادہ اضافہ ہوتا گیا۔ یہ سب کتابیں درس میں داخل ہوتی گئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج منطق کی بہت سی کتابیں پڑھ کر بھی منطق نہیں آتی کیونکہ جس کو منطق سمجھتے ہیں وہ منطق نہیں بلکہ فلسفہ ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج دو عالم جو باہم بحث کرتے ہیں تو ان کی تقریر منطقی قواعد سے بالکل الگ رہتی ہے۔ اسی طرح اصول فقہ کا فن فلسفہ سے بالکل الگ تھا، ملا محب اللہ نے اس میں بھی فلسفہ کا رنگ پیدا کیا اور اب اصول بھی گویا فلسفہ ہے۔

ہندوستان میں علم و فن کا رواج گو چھ سو برس سے ہے لیکن زیادہ تر منقولات کا رواج تھا، منطق و فلسفہ صرف قطبی تک پڑھاتے تھے، سب سے پہلے مولانا عبداللہ تلنبی المتوفی ۹۲۲ھ نے معقولات کی ترویج کی (۱) ان کے بعد قطب الدین شہید اور ان کے خاندان نے معقولات کو ترقی دی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ علما میں وہ تحقیق کم ہوگئی جو فقہا میں عموماً ہوتی ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں تکفیر کا باب اٹھا کر دیکھو اس کے مقابلہ میں مولانا بحر العلوم نے ارکان اربعہ میں امامت کی بحث میں جو کچھ لکھا ہے اس کا مقابلہ کرو تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ (الندوہ ج ۷ نمبر ۱۲ دسمبر ۱۹۱۰ء)

---

(۱) مآثر الکرام

استعداد پیدا نہیں ہوتی۔ بہرحال سالہا سال میں یہ قطعی فیصلہ کیا گیا کہ جو کچھ ہو جدید نصاب جاری کر دیا جائے، اس کے اجرا کے ساتھ ہی ایک مدرس صاحب نے استعفا دیا، اور اب اخبارات وغیرہ میں مضامین شائع کیے جا رہے ہیں کہ جدید نصاب درس کے قابل نہیں، بے شبہ اس نئے راستہ کے اختیار کرنے میں نہایت مشکلات پیش آ رہی ہیں، لیکن اگر ندوہ میں اس قدر بھی ہمت اور حوصلہ نہیں کہ وہ ان مشکلات کا متحمل ہو سکے تو اس کو سرے سے اصلاح نصاب کا نام چھوڑ دینا چاہیے، یہ سخت بد دیانتی ہے کہ تمام دنیا میں اصلاح نصاب کا غل مچایا جائے اور ایک ذرہ اصلاح نہ کی جائے۔

ہم نے اسی خیال سے اصلاح نصاب کے متعلق ایک سلسلہ وار مضمون شروع کیا ہے، جس کا پہلا نمبر آج کے پرچہ میں درج ہے۔

نصاب تعلیم

یہ ایک نہایت اہم سوال ہے کہ ہندوستان میں ہمارے علمی تنزل کا اصلی سبب کیا ہے، اس کے مختلف جواب دیے جاتے ہیں۔

عام جواب تو یہ ہے کہ تقدیر، لیکن یہ جواب صرف اسی سوال کا نہیں بلکہ دنیا کے تمام سوالوں کا جواب ہے اور ہم کو ایسے جواب کی ضرورت ہے جس کو اس سوال سے بھی کوئی خاص خصوصیت ہو، بعضوں کا خیال ہے کہ انقلاب سلطنت، لیکن اسلامی سلطنتوں کی نسبت کیا کہا جائے گا، خاص قسطنطنیہ میں کم سے کم بیس ہزار طلبا علوم عربیہ کی تعلیم پاتے ہیں لیکن مدتوں سے ایک شخص بھی صاحب کمال نہیں پیدا ہوا اور سچ یہ ہے کہ مصر و شام و روم کا علمی معیار ہندوستان سے بھی گھٹا ہوا ہے، اس سوال کا صحیح جواب صرف یہ ہے کہ "نصاب تعلیم کا نقص" اس کی تفصیل آگے آئے گی لیکن تفصیل سے پہلے بعض ظاہر الورود اعتراضات کا ذکر کرنا اور ان کا جواب دینا ضرور ہے۔

اس جواب پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسی نصاب نے سید علی بحر العلوم، حمد اللہ، محب اللہ بہاری، قاضی مبارک، شاہ ولی اللہ، ملا حسن جیسے شخص

پیدا کیے تھے، اس لیے اگر نصاب تعلیم کا قصور ہوتا تو اس سے اس درجہ کے کامل الفن کیوں کر پیدا ہوتے۔

اس اعتراض کا سرسری جواب تو یہ ہے کہ جو نصاب اب ہے وہ ان بزرگوں کے زمانہ میں کہاں تھا، شرح سلم حمد اللہ، شرح سلم ملا حسن، حاشیہ بحر العلوم، قاضی، غلام یحییٰ، حاشیہ سعیدیہ وغیرہ یہ کتابیں اس زمانہ میں کہاں تھیں لیکن اس اعتراض کا تحقیقی جواب یہ ہے کہ کسی چیز کی خرابی کا اثر عموماً ابتدا میں ظاہر نہیں ہوتا بلکہ یہ اثر پہلے پیدا ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ بڑھتا ہے، یہاں تک کہ بالآخر علانیہ ظاہر ہو جاتا ہے، موجودہ نصاب کی خرابی کا اثر پہلے ہی دن شروع ہو گیا تھا، جس کی بدیہی دلیل یہ ہے کہ جس دن سے یہ نصاب جاری ہوا ہے اسی وقت سے علم کا تنزل شروع ہو گیا، جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے یعنی جس درجہ کے علما اس وقت تھے ان کے شاگرد ان سے کم درجہ کے نکلے، شاگردوں کے شاگرد ان سے بھی کم، پھر ان سے بھی کم، یہاں تک کہ یہ زمانہ آگیا جس میں کمال کا نام و نشان بھی نہ رہا۔

پہلے طبقوں کا تنزل ہم کو اس لیے محسوس نہیں ہوتا کہ گو وہ لوگ علم و فضل میں اگلوں سے کم تھے، تاہم آج کی حالت کے لحاظ سے نہایت بلند رتبہ تھے، لیکن جب تنزل کی رفتار روز بروز تیز ہوتی گئی اور اب یہ نوبت پہنچی کہ تمام ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک ایک بھی صاحب فن نظر نہیں آتا تو کون شبہ کر سکتا ہے کہ یہ نتیجہ اسی تخم کا ثمر ہے جو سو برس پہلے بویا گیا تھا، ہم اس دعوے کے ثابت کرنے کے لیے امارات و قرائن پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ قطعی طریقہ سے ثابت کرتے ہیں کہ موجودہ نصاب تعلیم نہایت ناقص اور ابتر ہے، سب سے پہلے ہم کو چند مقدمات اصول موضوعہ کے طور پر ذہن نشین کر لینے چاہئیں اور وہ یہ ہیں۔

۱۔ تعلیم سے مقصود یہ ہے کہ غرض فن حاصل کیا جائے۔

۲۔ ہر فن کے حاصل کرنے کا یہ عمدہ طریقہ ہے کہ اس کے مسائل کو متفرق اور

باستقلال حاصل کیا جائے تاکہ اس فن کی طرف کافی توجہ ہو سکے، بجائے اس کے اگر چند فنون کے مسائل کو مخلوط کرکے حاصل کیا جائے گا تو کسی فن کی اچھی طرح تکمیل نہ ہوگی۔

۳۔ متعدد علوم و فنون کی تحصیل میں الاقدم فالاقدم کا خیال ضرور ہے یعنی یہ کہ جو فنون مقصود بالذات ہیں ان کے حاصل کرنے میں زیادہ وقت صرف کیا جائے، جو مقصود بالعرض ہیں ان میں کم، اسی طرح علوم مقصود بالذات بھی بلحاظ اہمیت کے فرق مراتب کرنا چاہیے یعنی جو علوم زیادہ مہتمم بالشان اور ضروری ہیں وہ زیادہ توجہ کے قابل ہیں۔

۴۔ ہر علم کی تحصیل میں سب سے مقدم یہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اس فن کی جو غایت ہے وہ حاصل ہو۔

مذکورہ بالا اصول کی صحت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اب ان اصول کی بنا پر ہم موجودہ نصاب سے بحث کرتے ہیں۔

۱۔ موجودہ نصاب میں اکثر کتابیں ایسی ہیں جن میں نفس مسائل کے علاوہ نہایت کثرت سے لفظی مباحث ہوتے ہیں جن کا مدار کسی کتاب کے خاص الفاظ پر ہوتا ہے یعنی اگر اصل مسئلہ کو دوسرے الفاظ میں بیان کیا جائے تو وہ تمام مباحث بیکار ہو جائیں۔ شرح شمسیہ میں یہ عبارت تھی کہ العلم اما تصور فقط وھو الخ قطبی میں اس کے متعلق ایک بڑی بحث اس بنا پر چھیڑ دی گئی کہ ھو کی ضمیر تصور کی طرف پھرتی ہے یا تصور فقط کی طرف، اس بحث میں قطبی اور میر کے کئی صفحے صرف ہو گئے، لیکن اگر مصنف ضمیر کے بجائے خود مرجع کو ذکر کر دیتا تو یہ تمام بحثیں رائگاں جاتیں، اس طرح بجائے اس کے کہ اصل مسئلہ پر وقت صرف کیا جائے، مصنف کے ایک خاص لفظ اور اس کے مفاد پر بے فائدہ وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔

نصاب موجودہ کی اکثر کتابوں کی یہی حالت ہے یعنی جس قدر اصل فن کے مسائل ہیں ان کے قریب بلکہ ان سے زیادہ یہ فضول لفظی مسائل ہیں۔

اس موقع پر یہ بات بتا دینا بھی ضروری ہے کہ قدما کے زمانہ میں شرح اور

حاشیہ کا طریقہ نہ تھا، بوعلی سینا کے بعد سے یہ طریقہ پیدا ہوا، لیکن اس وقت تک شرح
میں بھی مصنف کی خاص عبارت و الفاظ سے بحث نہیں کرتے تھے بلکہ اصل مسئلہ کی
توضیح اور تشریح کرتے تھے، لیکن بعد میں یہ طریقہ پیدا ہوا کہ اصل فن سے چنداں توجہ
نہیں رہی بلکہ تمام تر توجہ اس پر صرف ہونے لگی کہ مصنف کی عبارت کا کیا مطلب ہے؟
کس لفظ سے کیا فائدہ ہے؟ کون سی ضمیر کس طرف پھرتی ہے؟ مصنف کی
عبارت کا اوروں نے جو مطلب سمجھا ہے غلط ہے، فلاں جملہ مصنف نے دفع دخل مقدر
کیا ہے، مصنف کی عبارت پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ جس وقت سے یہ
طریقہ جاری ہوا وہ گویا تنزل کا پہلا دن تھا۔

علامہ ابن خلدون نے مقدمہ تاریخ میں ایک فصل لکھا ہے جس کی سرخی یہ
ہے "فی ان کثرۃ التالیف فی العلوم عائقۃ عن التحصیل" اس مضمون کا
ماحصل یہی ہے، چنانچہ مثلاً فن نحو کی بہت سی کتابوں کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:

وهي كلها متكررة والمعنى واحد والمتعلم مطالب بحفظ جميعها وتمييز ما بينها والعمر ينقضي في واحد منها ولو اقتصر المعلمون بالمتعلمين على المسائل المذهبية فقط لكان الأمر دون ذلك بكثير وكان التعليم سهلا	یہ تمام عبارتیں مکرر ہیں اور مطلب ایک ہے اور شاگرد پر لازم کیا جاتا ہے کہ وہ تمام عبارتوں کو یاد کرے اور عمر ایک ہی کے حفظ کرنے میں صرف ہو جاتی ہے، اگر استاد صرف مسائل مذہبی پر اکتفا کرتے تو تعلیم نہایت سہل ہوتی اور بہت کم زمانہ صرف ہوتا۔

عجیب بات یہ ہے کہ علامہ ابن خلدون کے زمانہ میں بھی یہی حالت تھی
جو اب ہے، یعنی باوجود اس طریقے کی خرابی کے لوگ اس کو ترک نہ کر سکتے تھے،
کیونکہ یہ طریقہ لوگوں کے لیے بجائے طبیعت ثانیہ کے ہو گیا تھا، چنانچہ علامہ
موصوف عبارت مذکورہ کے بعد لکھتے ہیں۔

ولکنه داء لا یرتفع لاستقرار العوائد علیه فصارت کالطبیعة	لیکن یہ ایک مرض بن گیا ہے جو رفع نہیں ہو سکتا کیوں کہ معمول عام ہو جانے کی وجہ سے وہ بجائے طبیعت کے ہو گیا ہے

۲- سب سے بڑی خرابی نصاب موجودہ کی یہ ہے کہ اس میں اکثر ایسی کتابیں داخل ہیں جن میں متعدد فن مخلوط ہیں، اس خلط مبحث کی وجہ سے طالب العلم کا ذہن پریشان ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کون سا فن حاصل کر رہا ہے، ملا حسن، حمد اللہ، قاضی مبارک منطق کی کتابیں ہیں لیکن ان میں اکثر مباحث الہیات اور مابعد الطبیعہ کے ہیں مثلاً علم باری، جعل بسیط، جعل مرکب، کلی طبعی کا وجود فی الخارج، وجود ذہنی وغیرہ وغیرہ۔

ملا جلال فن منطق میں بڑے معرکہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے لیکن جس قدر درس میں ہے، اس کا بڑا حصہ دیباچہ کی شرح میں ہے جو صرف اس خاص عبارت سے متعلق ہے جو مصنف نے حمد و نعت میں لکھی ہے، ان کتابوں کے درس کا جو زمانہ رکھا گیا ہے اس وقت تک میبذی کے سوا فلسفہ کی اور کوئی کتاب پڑھائی نہیں جاتی، اس لیے الہیات کے مباحث طالب العلم کو بالکل اجنبی اور سخت نامانوس معلوم ہوتے ہیں۔

۳- بہت بڑی غلطی یہ ہے کہ جو علوم مقصود بالعرض ہیں، ان کو مقصود بالذات بنا لیا گیا ہے اور زمانہ تحصیل کا بڑا حصہ انہیں کے حاصل کرنے میں صرف کر دیا جاتا ہے مثلاً نحو، صرف، منطق مقصود بالعرض ہیں لیکن کتب درسیہ زیادہ تر انہی فنون کے متعلق ہیں، منطق کا مقصود یہ ہے کہ فلسفہ میں کام آئے لیکن منطق کی درسی کتابیں فلسفہ کے اعتبار سے اضعافاً مضاعفہ ہیں، صغریٰ، کبریٰ، میزان منطق، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، ملا حسن، ملا جلال، میر زاہد، حمد اللہ، قاضی مبارک، یہ انبار کا انبار منطق میں ہے اور درس میں داخل ہے، لیکن فلسفہ کی صرف تین کتابیں درس میں داخل ہیں جن میں سے میبذی پوری پڑھائی جاتی ہے، باقی کے جستہ جستہ مقامات۔

اسی طرح نحو و صرف میں برسوں اوقات صرف کی جاتی ہے اور جو اس کی غرض و غایت ہے یعنی علم ادب اس میں بہت کم زمانہ صرف ہوتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ سیکڑوں ہزاروں طلبا میں سے ایک بھی صاحب فن نہیں پیدا ہوتا۔

علامہ ابن خلدون نے اس خرابی پر نہایت تفصیل سے بحث کی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

وأما العلوم التي هي آلة لغيرها مثل العربية والمنطق وأمثالها فلا ينبغي ان ينظر فيها الا من حيث هي آلة لذلك الغير فقط ولا يوسع فيها الكلام ولا تفرع المسائل لأن ذلك مخرج لها عن المقصود

باقی وہ علوم جو دوسرے علموں کا آلہ ہیں مثلاً عربیت اور منطق وغیرہ تو ان کو صرف اسی حیثیت سے دیکھنا چاہیے کہ وہ فلاں علم کا آلہ ہیں، ان میں نہ کلام کو وسعت دینی چاہیے نہ مسائل کی تفریع کرنی چاہیے کیونکہ ایسا کرنا اس کو اصل مقصد سے خارج کر دیتا ہے۔

فيكون الاشتغال بهذه العلوم الآلية تضييعاً للعمر وشغلاً بما لا يعني وهذا كما فعل المتأخرون في صناعة النحو وصناعة المنطق وأصول الفقه لأنهم أوسعوا دائرة الكلام فيها

تو ان علوم آلیہ میں مشغول ہونا عمر کا ضائع کرنا ہے اور لایعنی کام میں مشغول ہونا ہے جیسا کہ متاخرین نے نحو اور منطق اور اصول فقہ کے متعلق کیا یعنی کلام کے دائرہ کو بہت وسیع کر دیا۔

فهي من نوع اللغو وهي أيضاً مضرة بالمتعلمين على الاطلاق فاذا قطعوا العمر في تحصيل الوسائل فمتى يظفرون بالمقاصد

یہ تو ایک قسم کی لغویت ہے اور وہ طالب العلموں کو بھی عموماً مضر ہے۔
کیونکہ جب وہ مسائل ہی میں عمر ضائع کر دیں گے تو اصل مقصد تک کب پہنچیں گے۔

(الندوہ، ج ۱، نمبر ۲ جمادی الثانی ۱۳۲۲ھ)

مثلاً موجودہ فارسی یا اطالی زبان کی طرح نہیں جس میں تمام الفاظ ساکن الاواخر ہوتے ہیں اور عوامل کے آنے سے ان میں کوئی تغیر نہیں پیدا ہوتا، وہ نحو کے دائرے سے باہر ہوں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر زبان میں ادائے مطلب کے لیے الفاظ کی ترتیب کا خاص طریقہ ہے، یہ طریقے بعض مشترک ہوتے ہیں یعنی ہر کسی دوسری زبان میں بھی پائے جاتے ہیں اور بعض غیر مشترک ہیں جو خاص ایک ہی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں، انھیں طریقوں کے جزئیات کا نام نحو ہے اور نحو کی تدوین کے یہ معنی ہیں کہ ان تمام جزئیات کا استقصا کر کے ان کو کلیات کے تحت میں لایا جائے۔

علامہ ابن خلدون نے نحو کی تعریف ان جامع الفاظ میں کی ہے۔ بہ تبیین اصول المقاصد بالدلالة اس تعریف سے ثابت ہوگا کہ نحو کا اصلی مقصد ادائے معانی سے متعلق ہے، یعنی جب ہم ایک مطلب ادا کرنا چاہیں تو ہم کو فاعل، مفعول، متعلقات فعل وغیرہ کو کس ترتیب سے لانا چاہیے، باقی یہ امر کہ الفاظ پر ان ترکیب کا کیا اثر پڑتا ہے اور اواخر حروف کو کس حالت میں کون سا اعراب ہوتا ہے، یہ ایک ضمنی مسئلہ ہے، البتہ چونکہ نحو کی تدوین اصل میں علمائے عجم نے کی اور ان کے لیے اعراب کی صحت بھی ایک امر اہم تھی، اس لیے رفتہ رفتہ اعراب کی حیثیت اس قدر اہم ہو گئی کہ متاخرین نے اس کو عین نحو سمجھ لیا۔

جب یہ امر ثابت ہو گیا کہ نحو کا اصلی تعلق الفاظ کی ترتیب اور تقدیم و تاخیر سے ہے تو نحو کی ترتیب یہ ہونی چاہیے کہ کلام کے جو اجزا سب سے مقدم ہیں ان کا حال پہلے بیان کیا جائے پھر ان سے کم درجے کے اجزا کا حال پھر ان سے کم کا، اس لحاظ سے پہلے مسند الیہ کا حال بیان کرنا چاہیے، پھر مسند کا پھر متعلقات کا، پھر توابع کا، اس بنا پر مبتدا، فاعل، حروف مشبہ کے اسماء، افعال ناقصہ کی خبر وامثال ذٰلک کا حال ایک عنوان کے نیچے لکھنا چاہیے، لیکن متاخرین نے اس معنوی حیثیت کو چھوڑ کر صرف

اعراب کا لحاظ رکھا اور مرفوعات، منصوبات اور مجرورات کے لحاظ سے ترتیب قائم کی،
اس اعراب پرستی کی وجہ سے بہت سے مسائل کی حیثیت بدل گئی اور ان کے متعلق
ترتیب میں فرق آ گیا چنانچہ ہم چند مثالیں ذیل میں درج کرتے ہیں۔

۱۔ مفعول لہٗ معنی کے لحاظ سے مجرور بالطلاق ہے، جیسے ضربتہ تادیباً اور ضربتہ
للتادیب میں معنی کی طرح کا فرق نہیں لیکن صرف اس وجہ سے کہ اس کو فتحہ ہوتا ہے،
اس کے لیے زبردستی ایک نیا نام ایجاد کیا گیا اور اس کو مفعول کے اقسام میں شمار
کیا گیا۔

یہی کیفیت مفعول معہٗ کی ہے، خوب غور سے دیکھو معنی کے اعتبار سے مفعول
معہٗ اور معطوف بالکل ایک ہیں، محض اعراب کی بنا پر اس کو مفعول کا لقب دیا گیا،
حالانکہ یہ بہت آسان بات تھی کہ اس کو واؤ عطف کے تحت میں بیان کیا جاتا اور اس
قدر اضافہ کر دیا جاتا کہ بعض موقعوں پر معطوف کو فتحہ ہوتا ہے، اس کے ساتھ مفعول معہٗ
کے خصوصیات بیان کر دی جاتیں۔

۲۔ حروف مشبہ کے اسم و خبر ایسے ہیں اور اس لحاظ سے ان کو فاعل اور مبتدا
کے ساتھ بیان کرنا چاہیے، لیکن اعراب کے لحاظ سے وہ منصوبات میں داخل کیے گئے،
اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔

ایک بڑا نقص موجودہ نحو میں یہ ہے کہ کلمات کے بہت سے اقسام اور
اصطلاحات بے فائدہ بنائے گئے ہیں، چنانچہ ہم چند مثالیں درج ذیل کرتے ہیں۔

۱۔ مفعول ما لم یسم فاعلہٗ کو ایک خاص اصطلاح قرار دینا اور اس کے مسائل
جدا گانہ لکھنا بے کار ہے، مفعول ما لم یسم فاعلہ کوئی الگ چیز نہیں، بلکہ فعل مجہول کے
فاعل کا نام ہے، فاعل کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس سے فعل کا ارتکاب ہوا ہو، بلکہ
اصطلاحِ نحو میں فاعل کے لیے صرف اس قدر کافی ہے کہ وہ فعل یا شبہ فعل کا مسند الیہ
ہو، یہ ظاہر ہے کہ ضرب زید میں مضروبیت کی اسناد زید کی طرف ہے، اس بنا پر وہ

بھی اسی طرح فاعل ہے جس طرح ضرب زیدٌ میں زید۔

۲۔ افعال ناقصہ کو تمام افعال سے جدا کر قرار دینا اور اس کے معمول کے لیے بالکل ایک نئی اصطلاح اسم و خبر کے نام سے قائم کرنا محض لغو ہے، یہ غلطی اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ افعال ناقصہ کو بعض نے لازم سمجھا ہے، حالانکہ وہ درحقیقت متعدی ہیں، چنانچہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

۳۔ افعال مقاربت کی جداگانہ اصطلاح قائم کرنا بے فائدہ ہے، افعال مقاربت میں جس چیز کو اسم کہتے ہیں وہ درحقیقت فاعل ہے اور جس کو خبر کہتے ہیں وہ مفعول ہے، ان افعال میں بھی فعل تنہا فاعل پر تمام نہیں ہوتا بلکہ ایک اور چیز کا محتاج رہتا ہے اور وہی مفعول ہے۔

۴۔ اسی طرح افعال مدح و ذم کی اصطلاح کی بھی ضرورت نہیں نعم الرجل زید میں الرجل فاعل ہے اور زید بدل اور یہ معمولی ترکیب ہے۔

متعدی کی تعریف کافیہ وغیرہ میں یہ کی ہے: ما توقف فہمہ علی متعلق الی آخرہ افعال ناقصہ گویا متعدی ہیں کیونکہ ان کا مفہوم تنہا فاعل سے سمجھ میں نہیں آتا، علامہ رضی نے تصریح کی ہے کہ اس تعریف کی بنا پر قرب وغیرہ متعدی ہیں، چنانچہ لازم و متعدی کی بحث میں لکھتے ہیں: وعلی ما حد ینبغی ان یکون نحو قرب و بعد و خروج و دخل متعدیا اذ لا یفہم معانیہا الا بمتعلق اس بنا پر افعال ناقصہ کے اسم و خبر درحقیقت فاعل و مفعول ہیں۔

(الندوہ ج ۶ نمبر ۲ شوال ۱۳۲۷ھ)

تعلیم قدیم و جدید

کی زحمت اٹھائیں۔

لیکن اب اس سکون میں کچھ جنبش پیدا ہو چلی ہے، کیونکہ اب ہر گروہ جس قسم کی تعلیم کا حامی ہے، چاہتا ہے کہ تمام ملک میں وہی تعلیم پھیل جائے، اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ دونوں گروہوں میں تقابل، مسابقت اور مجادلہ پیدا ہو، چنانچہ ایسا ہوا، صرف یہ امتیاز باقی رہا کہ پست حوصلہ لوگوں نے علانیہ اپنے حریف مدارس اور انجمنوں کی برائی شروع کی اور مہذب حضرات نے دل آزاری اور بدگوئی سے احتراز کیا۔

اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمانوں سے دونوں کو بہ قدر کافی اپنے کام کے لیے مدد مل سکتی ہے، لیکن واقعی اب اس کا وقت آ گیا ہے کہ تمام قوم مل کر ایک وسیع خاکہ تیار کر دے، جس میں تمام درسگاہوں اور انجمنوں کی نسبت طے کر دیا جائے کہ کون کون ضروری ہیں، کس حد تک ضروری ہیں؟ اور مجوزہ نقشہ میں ہر ایک کی جگہ کہاں ہے؟ تاکہ جو کام ہو رہے ہیں سب مل کر ایک کام بن جائیں اور ایک کام دوسرے کام میں خلل انداز نہ ہونے پائے، اور نہ دو طرفہ کشاکش میں ہزاروں لاکھوں مسلمان یہ فیصلہ نہ کر سکیں گے کہ وہ کس رخ اور کدھر جائیں۔

اس غرض سے سوالات ذیل پر نظر ڈالنی چاہیے۔

جدید تعلیم ضروری ہے یا نہیں؟

قدیم تعلیم ضروری ہے یا نہیں؟

دونوں میں اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں؟

اصلاح کا کیا طریقہ ہے؟

علی گڑھ، دیوبند، ندوہ کے کیا حدود ہیں اور کون کون کام کس کس کے حد عمل میں چھوڑ دینے چاہئیں۔

پہلے سوال کے جواب میں اب اختلاف نہیں رہا اور اگر کسی کو ہو تو ہم کو اس سے خطاب کرنے کی ضرورت نہیں۔

دوسرے سوال کا جواب جدید گروہ کے ذہن میں دفعۃً نفی کی صورت میں آئے گا، لیکن ان کو ذرا غور سے کام لینا چاہیے اور پہلے ان سوالات کا جواب دینا چاہیے۔

کیا مسلمانوں کی قومیت مذہب کے سوا اور کچھ ہے؟

اگر نہیں ہے تو مذہب کے قیام کے بغیر ان کی قومیت کیوں کر قائم رہے گی؟

اگر مذہب کی ضرورت ہے تو مذہبی تعلیم بلکہ یہ تعلیم کے بغیر کیوں کر ممکن ہے؟

شاید یہ کہا جائے کہ انگریزی کے ساتھ مذہبی تعلیم بہ قدر ضرورت ممکن ہے اور اسی قدر کافی ہے لیکن کیا صرف اسی قدر تعلیم سے قرآن و حدیث کی حفاظت ہو سکتی ہے، کیا اس درجہ کے تعلیم یافتہ اسلامی مشکل مسائل کی تشریح کر سکتے ہیں، کیا غیر مذہب والے مذہب اسلام اور تاریخ اسلام پر جو اعتراضات کرتے ہیں ان کے مقابلہ کے لیے اتنی تعلیم کافی ہے؟ کیا اس قدر تعلیم پائے ہوئے لوگ مذہبی خدمات مثلاً وعظ، امامت، فتویٰ وغیرہ انجام دے سکتے ہیں؟ کیا عوام پر ان لوگوں کا کوئی مذہبی اثر قائم ہو سکتا ہے؟

تیسرا سوال یعنی یہ کہ دونوں طریقۂ تعلیم میں اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں، ایک معرکہ کا سوال ہے، مگر اس لیے کہ در حقیقت وہ ایسا ہے بلکہ اس لیے کہ دونوں فریق ایک مدت سے اسی حالت پر قائم ہیں اور چونکہ دونوں اپنے اپنے حوصلہ کے مطابق کامیاب ہیں، اس لیے ان کو غالباً نظر آتا ہے کہ اصلاح کی ضرورت نہیں، تاہم جدید گروہ بہ آسانی اپنے خلاف نکتہ چینی سننے پر آمادہ ہو سکتا ہے، اس لیے پہلے ہم انھیں سے خطاب کرتے ہیں۔

اس قدر مسلم ہونے کے بعد کہ تعلیم جدید کے ساتھ کسی قدر مذہبی تعلیم ضروری ہے، یہ سوال باقی رہتا ہے کہ اس ضرورت کی مقدار کیا ہے؟ اور اس کا کیا طریقہ ہے؟

یہ ظاہر ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں سے ہم کو مذہبی خدمات یعنی امامت، وعظ، افتا کا کام لینا نہیں ہے بلکہ غرض یہ ہے کہ وہ خود بہ قدر ضرورت مسائل اسلام اور تاریخ اسلام سے واقف ہوں، اس کے لیے صرف ایک مختصر اور جامع وماتع سلسلۂ دینیات کی ضرورت ہے، جس میں سلسلہ بہ سلسلہ اسکول سے کالج کلاسوں تک کے قابل کتابیں ہوں، اس سلسلہ میں تین قسم کی کتابیں ہونی چاہئیں۔ فقہ، عقائد، تاریخ اسلام، فقہ اور تاریخ کے متعلق مصر میں عمدہ کتابیں تیار ہوئی ہیں، ان کا ترجمہ کافی ہوگا، عقائد کی نسبت البتہ مشکل ہے کیونکہ ہندوستان میں جو کتابیں آج کل لکھی گئی ہیں ان پر ابھی تمام لوگوں کا اتفاق نہیں ہوسکتا اور مصر وغیرہ کی جدید تصنیفات ناکافی اور ناقابل درس ہیں، اس لیے یہ بہتر ہوگا کہ اسکول کلاسوں میں صرف فقہ، تاریخ اسلام اور سادہ عقائد کی تعلیم ہو اور کالج کلاسوں میں امام غزالی اور ابن رشد اور شاہ ولی اللہ صاحب کی چیدہ تصنیفات خود عربی کی زبان میں پڑھائی جائیں اور ان سب کی مجموعی ضخامت سو دو سو صفحوں سے زیادہ نہ ہو۔

لیکن نہایت مقدم امر یہ ہے کالجوں میں صرف کتابی تعلیم سے مذہبی اثر نہیں پیدا ہوسکتا بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ طلبہ کے چاروں طرف مذہبی عظمت کی تصویر نظر آئے، دینیات کے نتائج امتحان کو انگریزی تعلیم کے نتائج کی طرح لازمی قرار دیا جائے، مذہبی لیکچر قرار مشاہرہ کے مقرر کیے جائیں، وعظ کے موقعوں پر اکثر ارکان کالج کا امکان شریک ہوں، مذہبی پابندی کی بنا پر طلبہ کی خاص توقیر اور تحسین کی جائے اور سب سے مقدم یہ ہے دو چار طلبہ کو اس بہا وظائف دے کر ڈگری حاصل کرنے کے بعد مذہبی اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلائی جائے۔

یہ امر اگرچہ بدیہی ہے کہ قدیم تعلیم میں سخت اصلاح اور اضافہ کی ضرورت ہے، لیکن افسوس ہے کہ بڑے بڑے مقدس علماء اب تک اس ضرورت کے قائل نہیں، اس لیے ہم ان سے سوالات ذیل کے جواب چاہتے ہیں۔

آواز بھی میرے کانوں میں آیا کرتی تھی کہ ممکن ہے کہ خود ہوا کا رخ بدل جائے۔ مشرقی کانفرنس اسی خواب کی تعبیر ہے۔

مشرقی تعلیم کی تحریکیں اس سے پہلے بھی ہوئیں، ڈاکٹر لائیز کی سرگرم کوششوں سے پنجاب میں تعلیم مشرقی کی ایک شاخ یونی ورسٹی میں قایم ہوئی، الہ آباد یونی ورسٹی میں مولوی فاضل کے امتحانات اسی خیال کے نا تمام خاکے ہیں، سرسید مرحوم نے ہمیشہ ان کوششوں کی سخت مخالفت کی۔ پنجاب یونی ورسٹی پر ان کے تمن پر زور آرٹیکل، تلوار نہیں تو توپیں تھیں جن کے صدمہ نے مشرقی تعلیم کو چلتا پھرتا دیا۔ الہ آباد یونی ورسٹی جب بن رہی تھی اور بظاہر نظر آتا تھا کہ اس میں بھی مشرقی تعلیم کی شاخ کھول جائے گی تو سرسید نے متعدد آرٹیکل اس زور کے لکھے کہ اس تجویز کے پرخچے اڑ گئے، سرسید کی مخالفت اس بنا پر تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ مشرقی تعلیم کی یہ کوشش مغربی تعلیم کو روک دے گی جو ملک کے لیے نہایت ضرر رساں کام ہے۔

اس میں ایک ذرہ شبہ نہیں کہ اگر ہم کو یہ یقین ہو کہ مشرقی تعلیم کی کسی تجویز سے مغربی تعلیم میں ذرہ برابر بھی کمی ہوگی تو ہمارا فرض ہے کہ اس تجویز سے علانیہ نفرت کا اظہار کر دیں۔

مسلمان اس وقت کشمکش زندگی کے میدان میں ہیں، ان کی ہمسایہ قومیں مغربی تعلیم ہی کی بدولت ان سے اس میدان میں بڑھ رہی ہیں، اگر خدانخواستہ مسلمان مغربی تعلیم کی کوشش میں ذرا بھی پیچھے رہ جائیں تو ان کی ملکی اور قومی زندگی دفعۃً برباد ہو جائے گی۔

لیکن اب وہ حالت نہیں ہے، مسلمانوں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ ان کی دنیوی ترقی صرف اس بات پر موقوف ہے کہ ان کا ایک ایک بچہ انگریزی میں تعلیم یافتہ ہو جائے، لیکن باوجود اس کے یہ ممکن ہے کہ مشرقی تعلیم کے لیے بھی جگہ نکل سکے، ترقی یافتہ قوموں کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے، یورپ سب کچھ کر رہا ہے تاہم ان میں

ایک وسیع گروہ موجود ہے جو اپنی مذہبی تعلیم اور مذہبی لٹریچر کا محافظ ہے، خود ہماری
ہمسایہ قوموں کا کیا حال ہے، آریہ انگریزی تعلیم میں اس تیزی سے ترقی کر رہے ہیں
کہ مسلمان ان کی گرد تک بھی نہیں پہنچے، تاہم وہ گروکل بھی قائم کر رہے ہیں جو
سنسکرت کی تعلیم کے لیے مخصوص ہے اور جس کا مقصد صرف اپنے مذہب اور اپنے
لٹریچر کی اشاعت ہے، اس گروکل میں جو لڑکے داخل ہوتے ہیں ان سے عہد لیا جاتا
ہے کہ دنیا کا کوئی کام شغل نہ کریں گے، ۲۴ برس کی عمر تک ان کو تعلیم دی جاتی ہے، ان کو
نہایت سادی اور خشک غذا دی جاتی ہے، سونے کو لکڑی کا تخت ہے، اپنے ہاتھ سے
سب کام کرنا پڑتا ہے، اس جفاکشی اور دنیا کی بے تعلقی کے ساتھ بھی سو دولت مندوں
نے اپنے بچے اس میں داخل کر دیے ہیں، اور ۲۴ ہزار ایک ایک بچہ کا خرچ دیتے ہیں،
ہر سال اس مدرسہ کے لیے لاکھوں کا چندہ جمع ہو جاتا ہے، اور اس کی شاخیں جا بجا قائم
ہوتی جاتی ہیں۔

کیا اس مدرسہ نے آریوں میں انگریزی تعلیم کو کم کر دیا ہے؟ یا انگریزی
تعلیم پر کوئی برا اثر ڈالا ہے؟ بلکہ سچ یہ ہے کہ اس کے تعلیم یافتہ مدرسہ سے نکل کر تمام
قوم میں انگریزی تعلیم اور دنیاوی ترقی کی روح پھونک دیں گے، تیر انداز اونچی جگہ پر
رہتا ہے، لیکن تیر کوسوں نکل جاتا ہے، رجز خواں خود نہیں لڑتے لیکن ہزاروں لڑنے
والے پیدا کر دیتے ہیں۔

غرض اگر یورپ کو باوجود ترقی علمی پادریوں کی جماعت سے، اگر آریوں کو با
وجود انگریزی تعلیم کے گروکل کی ضرورت ہے تو مسلمانوں کو بھی عربی تعلیم اور مذہبی تعلیم
کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک مسلمانوں کی قوم
کا باقی رہنا ضرور ہے۔

انھیں اسباب سے باوجود تمام مخالفتوں کے ندوہ قائم ہوا اور باوجود تمام
مزاحمتوں کے اس نے اپنا وجود قائم رکھا، یہ سوال پہلے ہی دن پیدا ہوا کہ ندوہ کے تعلیم

سے واقف کرنا۔

(۳) اعلیٰ طریقہ پر قدیم قلمی کتب خانوں کی فہرست سازی (کیٹلوگنگ)
کی تعلیم دینا۔

(۴) اعلیٰ مشرقی تعلیم کے لیے بیش قرار وظائف مقرر کرنا۔

(۵) دینی زبانوں کو ترقی دینا اور ان کے لیے امتحانات قائم کرنا۔

(۶) اعلیٰ مشرقی تعلیم یافتوں کے لیے کالجوں میں پروفیسری، مدرسوں میں
ٹیچری، عجائب خانوں میں تحقیقات آثار قدیمہ اور قدیم کتب خانوں میں ترتیب
فہرست کے لیے عہدے قائم کرنا۔

(۷) کلکتہ کی مشرقی درسگاہوں کو متفق و متحد کرنا۔

(۸) افسروں کی زبان دانی کا امتحان لینا۔

(۹) کلکتہ میں اغراض بالا کے لیے ایک عظیم الشان مشرقی درسگاہ قائم کرنا۔

یہ ظاہر بات ہے کہ علما کا گروہ مسلمانوں کی جماعت کا ایک ضروری جز ہے
ان کی تعداد کثیر ملک میں موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گی، ان کا قوم پر نہایت قوی
اثر ہے، عربی زبان ایک علمی زبان ہے، ان اسباب سے یہ مناسب نہیں کہ مشرقی تعلیم
سے بالکل بے اعتنائی اختیار کی جائے، البتہ اس کی ضرورت ہے کہ اس کو زیادہ بکار آمد
بنایا جائے اور مذہبی حصہ کو چھوڑ کر باقی چیزوں میں ایسی ترقی اور اصلاح کی جائے کہ
مشرقی تعلیم یافتہ لوگوں کی معاش کے لیے کچھ وسائل پیدا ہو سکیں۔

کانفرنس نے جو کچھ طے کیا ہے، ابھی اس کی باضابطہ منظوری نہیں ہوئی ہے،
اس لیے اس کی تفصیل ابھی غیر ضروری ہے، لیکن بظاہر حسب ذیل نتائج کی توقع کی
جا سکتی ہے۔

(۱) گورنمنٹ کی طرف سے ایک انسپکٹر ہوگا جو قدیم عربی مدارس کا معاینہ
کرسکے گا، اگر مدرسہ کے مہتمم ایسی نگرانی کو پسند کریں گے۔

(۲) جن مدرسوں کو گورنمنٹ اس قابل سمجھے گی ان کو بیکمشت امداد دے گی۔

(۳) کلکتہ میں بہت بڑے وسیع پیمانے پر ایک مشرقی درس گاہ قائم ہوگی۔ مدارس عربیہ کے فارغ شدہ اگر چاہیں گے تو اس درس گاہ میں تعلیم حاصل کریں گے۔

(۴) اس درس گاہ کے تعلیم پانے والوں کو بیش قرار وظیفے دئے جائیں گے۔

(۵) اس درس گاہ سے سند لینے کے بعد ان کو متعدد اسامیاں مل سکیں گی، جو مشرقی تحقیقات سے متعلق ہوں گی۔

(۶) مدارس عربیہ جن کو گورنمنٹ تسلیم کرے گی اور جس کے تعلیم یافتہ کم سے کم انگریزی زبان جانتے ہوں گے، ان کو کالجوں اور سکولوں کی پروفیسری اور مدرسی مل سکتی ہے۔

ان واقعات کے بیان کرنے سے غرض یہ ہے کہ جو فرقہ اب تک بغیر کسی معاوضہ کے عربی علوم کی تحصیل میں مشغول تھا، اب کسی قدر ذریعہ معاش حاصل ہونے کی صورت میں امید ہے کہ اپنا کام زیادہ مستعدی اور زیادہ وسعت و حوصلہ سے انجام دے۔ ہم لوگ اگر عربی علوم اور مذہبی علوم کے دلدادہ اور جاں نثار ہیں تو اس قدر معاوضہ ہمارے لیے بالکل کافی ہے اور کوئی غیر گورنمنٹ اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے۔

(الندوہ جلد ۸ نمبر ۸، اگست ۱۹۱۱ء)

ریاست حیدرآباد
کی
مشرقی یونیورسٹی

معلوم نہیں مسلمانوں میں کون سی مبارک ساعت میں تقلید کی بنیاد پڑی تھی کہ زمانے کے سیکڑوں ہزاروں انقلابات کے ساتھ بھی اس کی بندشیں اب تک کمزور نہیں ہوئیں، تعجب اور سخت تعجب ہے کہ جدید تعلیم یافتہ فرقہ جو اجتہاد اور جدت کا دعویدار ہے اور در حقیقت جدید تعلیم کا یہی اثر ہونا چاہیے تھا، وہ بھی اسی طرح بے سمجھے بوجھے، ایک عام راستے پر پڑ لیا ہے اور کچھ نظر نہیں آتا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں، جس تعلیم اور نتائج تعلیم کا اس قدر شور و غل ہے، وہ کیا ہے؟ کالجوں کی ڈگریاں اور نوکریاں وغیرہ، شاید کہا جائے کہ اس کے سوا ہم اور کیا کر سکتے ہیں اور اسی لیے تو ہم اپنی خاص یونی ورسٹی چاہتے ہیں کہ اپنی ضرورتوں کے موافق اپنی تعلیم کا سامان بہم پہنچائیں، لیکن مجبوری یہ ہے کہ اس قدر روپیہ بہم نہیں پہنچتا کہ یونی ورسٹی بن سکے، لیکن سوال یہ ہے کہ جہاں یونی ورسٹی بن سکتی ہے، وہاں کیا ہو رہا ہے؟ حیدرآباد میں عنانِ تعلیم انھیں لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے جو ہندوستان میں یونی ورسٹی بنانے کے محرک اور جان دادہ ہیں، یونی ورسٹی کے لیے دس لاکھ روپیہ مانگا جا رہا ہے، حیدرآباد میں ایک منٹ میں یہ رقم مل سکتی ہے، حیدرآباد میں صرف ایک کالج پر ڈیڑھ لاکھ روپیہ صرف ہو رہا ہے، حیدرآباد کو اس بات کی کچھ پروا نہیں ہو سکتی کہ اگر وہ اپنی یونی ورسٹی بنائے تو اس کے تعلیم یافتہ انگریزی گورنمنٹ میں نوکریاں نہ پائیں گے، کیوں کہ حیدرآباد خود ایک وسیع ریاست

کتب درسیہ کی ضرورت ہے۔"

نواب صاحب موصوف کا یہ خط اس وقت پہنچا جب مجھ پر پاؤں کے زخمی ہونے کا واقعہ گذر چکا تھا اور میں صاحب فراش تھا، جب اس سے صحت ہوئی تو مولوی عزیز مرزا صاحب ہوم سکریٹری حیدرآباد نے نواب عماد الملک بہادر کی تحریک کی بنا پر مجھ کو پھر طلب کیا اور میں جون ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد گیا، وہاں چند روز رہ کر ایک نصاب تیار کیا اور اس کے متعلق ایک یادداشت لکھی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نصاب کن اصول پر تیار کیا گیا ہے، یادداشت مذکور کی نقل درج ذیل ہے۔

رپورٹ
متعلق
اصلاح نصاب دار العلوم حیدرآباد

بموجب مراسلہ ناظم صاحب سابق نواب عماد الملک بہادر و مراسلہ ناظم صاحب حال مورخہ ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۱۷ ہجری نمبر (۱۲۲۳) دار العلوم کے نصاب اور مدت تعلیم میں جو تغیر اور اصلاح میں نے کی ہے، اور جس کا نقشہ اس یادداشت کے ساتھ منسلک ہے، اس کی نسبت میں ایک علاحدہ مفصل یادداشت پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جس سے یہ ظاہر ہوگا کہ ترمیم اور اصلاح کن اصولوں پر کی گئی اور ترمیم اور اصلاح کی مہمات امور کیا ہیں۔

نصاب دار العلوم کی ترتیب دینے کے وقت سب سے پہلے یہ امر پیش نظر ہونا چاہیے کہ دار العلوم کا اصلی مقصد کیا ہے اور کس قسم کے لوگ اس سے پیدا کرنے مقصود ہیں۔

دار العلوم جب تک پنجاب یونیورسٹی سے متعلق رہا اس کی غرض صرف ایسے لوگوں کا پیدا کرنا تھا جو سرکاری دفاتر میں کام کرنے کے لائق ہوں اور اس مقصد

لیے اس کی توقع ہے کہ موجودہ طریقۂ تعلیم کے علاوہ ایک نیا خاص سلسلۂ تعلیم بھی قائم کرے جس میں انگریزی تعلیم کے ساتھ اسلامی علوم اور اسلامی تاریخ بھی شامل ہو اور جس سے تعلیم یافتہ گروہ دونوں قسم کی تعلیم کا مجموعہ ہوں۔ اس قسم کی تعلیم کا انتظام دار العلوم میں جو کچھ ہے اور ہم کو موجودہ نصاب کے مرتب کرنے میں اس پہلو کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔

اغراض مذکورہ بالا کے لحاظ سے نصاب موجودہ میں جو تغیر اور اضافہ کیے گئے ہیں اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) ہر فن کی تعلیم کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ ایسی کتابیں درس میں رکھی جائیں جن میں تمام مسائل نہایت سادہ، صاف اور واضح طریقے سے بیان کیے گئے ہوں تاکہ طالب العلم بہ آسانی تمام مسائل پر حاوی ہو جائے۔ اس بنا پر وہ کتابیں جو معما اور چیستاں کے طور پر اس قدر مختصر اور مغلق لکھی گئی ہیں کہ ایک ایک سطر میں ایک ایک صفحے کے مطالب چھپا دیے گئے ہیں، وہ خارج کردی گئیں۔

(۲) قدیم نصاب میں اکثر ایسی کتابیں ہیں جن میں دوسرے علوم کے مسائل مخلوط کردیے گئے ہیں، اس خلط مبحث کی وجہ سے طالب العلم اس فن کے مسائل سے دور رہ جاتا ہے۔ مثلاً ملا حسن، میر زاہد، قاضی مبارک وغیرہ کہ یہ کتابیں دراصل منطق میں ہیں لیکن ان میں فلسفہ اور امور عامہ کے دقیق مسائل اس قدر شامل کر دیے ہیں کہ اصل فن کے مسائل پر گویا پردہ پڑ گیا ہے، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ تمام کتابیں پڑھ کر بھی طالب العلم کو فن منطق کے مسائل کی مشق نہیں ہوتی اور وہ نہیں کر سکتا کہ تقریر اور مناظرے میں اپنے دعووں کو اشکال منطقی کے ذریعے سے ثابت کر سکے۔

اس بنا پر نصاب حال میں ہر فن میں وہی کتابیں رکھی گئی ہیں جن میں خاص اسی فن کے مسائل استیعاب کے ساتھ مذکور ہیں۔

(۳) قدیم نصاب میں قرآن مجید کی تعلیم کا حصہ نہایت کم ہے۔ قرآن مجید کا

وقعت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اس کی تدبیر صرف یہ ہے کہ ایسے پروفیسر مقرر کئے
جائیں جنھوں نے کالج میں تعلیم پائی ہو اور عربی زبان ان کی زبان تکلم ہو۔
(۹) انگریزی زبان بطور سکنڈ لینگویج کے لازمی قرار دی گئی ہے۔ میں انگریزی
زبان سے واقف نہیں ہوں، اس لئے میں نے انگریزی کتابوں کا نام نہیں لکھا ہے۔
لیکن اس قدر بخوبی پتہ ہے کہ موجودہ نصاب میں اس قدر گنجائش ہے کہ انگریزی
زبان دانی کی کتابیں متوسط تک کی اس میں شامل کی جا سکتی ہیں اور درجہ فاضل کے
بعد دو برس اس غرض سے رکھے گئے ہیں کہ جو شخص چاہے دو برس تک صرف انگریزی
زباندانی کی تعلیم حاصل کرے جس سے وہ انگریزی زبان پر بخوبی قادر ہو سکتا ہے۔
(۱۰) نصاب سابق میں ابتدا سے اخیر تک مدت تعلیم ۱۹ برس تک تھی لیکن یہ
مدت بہت زیادہ تھی، اس لئے گھٹا کر کل مدت ۱۲ برس قرار دی گئی ہے۔
(۱۱) نصاب مرتبہ کی ترتیب یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کی مدت ۵ سال قرار دی
گئی ہے اور یہ فرض کر لیا ہے کہ لڑکے سات آٹھ برس کی عمر سے دار العلوم کی ابتدائی
جماعتوں میں لئے جائیں گے۔ یہ تعلیم پانچ برس میں تمام ہوگی اور اس میں اردو اور ابتدائی
فارسی اور حساب اور کسی قدر انگریزی کی تعلیم ہوگی۔
اس درجہ کے بعد دو الگ شاخیں شروع ہوں گی، منشی اور عالم۔ طالب
العلم کو اختیار ہوگا کہ ان دونوں شاخوں میں سے جس شاخ کو چاہے اختیار کرے۔
منشی کے ۳ سال اور منشی عالم کے ۲ سال اور منشی فاضل کا ایک سال مقرر
کیا گیا ہے۔ منشی فاضل تک نصاب اعلیٰ فارسی زبان کی تکمیل ہے اور عربی کی
سوادخوانی اور انگریزی بقدر ضرورت پڑھائی جائے گی۔
عالم کے دو درجے قرار دئے گئے۔
عالم اس کی مدت تعلیم ۴ برس ہے جو بی اے کے برابر ہے۔ اس میں
تمام ضروری ادب عربی اور بقدر ضرورت علوم جدیدہ اور انگریزی زباندانی اس درجہ تک

احیاءِ علومِ عربیہ اور ایک ریڈیکل

ضبط کروں میں کب تک آہ! چل رے خامہ بسم اللہ

جدید تعلیم کے فرزندانِ رشید میں سے ایک صاحب نے جو اپنے آپ کو "ریڈیکل" کہتے ہیں، ابھی گذشتہ منتخل میں ایک مضمون "احیاءِ علومِ عربیہ" کے عنوان سے لکھا ہے، مضمون کا شانِ نزول وہ تحریک ہے جس کا منشا یہ ہے کہ علی گڈھ میں علومِ عربیہ کی تعلیم کا انتظام کیا جائے، یہ تحریک ایک انگریزی پروفیسر کی طرف سے پیش ہوئی تھی، جس کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ خود گورنمنٹ کے ایما کو بھی اس میں شائبہ تھا۔

ہمارے قومی لیڈروں نے نہایت دلیری، نہایت آزادی، نہایت استقلال سے اس تجویز کی مخالفت کی اور دنیا پر ثابت کر دیا کہ ایسے ضروری موقع پر جب کہ احتمال تھا کہ مسلمانوں کی قوم اس تجویز سے دفعۃً برباد ہو جائے، مختلف پہلوؤں کو یہ اعتراض واپس لینا پڑے گا کہ ہمارے لیڈر کسی انگریز افسر کی تحریک کی مخالفت نہیں کر سکتے۔

لیکن اس وقت تک مخالفت کی جو وجہ ارکانِ کالج یعنی نواب محسن الملک اور مولوی نذیر احمد صاحب نے اپنے پرزور لفظوں میں ظاہر کی وہ صرف یہ تھی کہ ابھی یہ وقت نہیں آیا کہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے ایک منٹ کے لیے بھی دوسری چیزوں کی طرف متوجہ ہونے کی اجازت دی جائے۔

اگرچہ یہ امر کچھ کم تعجب انگیز نہ تھا کہ ایسا کالج جس کے نام کے ساتھ اورینٹل کا لفظ شامل ہے جو ہمیشہ تحریروں اور تقریروں کے ذریعے سے مسلمانوں کی قومی

اور مذہبی تعلیم کے مرکز ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، جو اپنے مہمات کو ایران تک وسیع کرکے وہاں کے لوگوں کو اپنے دائرۂ اثر میں لانا چاہتا ہے، جس کی مجوزہ یونیورسٹی کی ایک بڑی خصوصیت علوم مذہبی کا احیاء ہے، عربی تعلیم کی طرف سے صریح اپنی بے اعتنائی کا اعلان کرے، کیونکہ یہ بالکل ممکن تھا کہ انگریزی تعلیم کو بغیر کسی قسم کے نقصان پہنچانے کے عربی تعلیم کا بھی بقدر ضرورت انتظام کیا جاتا، تاہم ان بزرگوں نے نفس علوم عربیہ پر کوئی حملہ نہیں کیا تھا، جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ علوم عربیہ کے بڑھنے سے (جیسا کہ ریڈیکل صاحب نے بیان کیا ہے) طبیعت میں آزادی اور دلیری نہیں پیدا ہوتی اور بزرگان ممدوح علوم عربیہ ہی سے تعلیم یافتہ ہیں۔

لیکن ریڈیکل صاحب تعلیم جدید کے یادگار ہیں، اس لیے وہ نہایت آزادی اور دلیری سے آگے بڑھے اور اصل راز کا پردہ اٹھا دیا یعنی یہ کہ علوم عربیہ خود اس قابل نہیں کہ ان کی تعلیم پر وقت ضائع کیا جائے، ان کے منتخب فقرے بعینہٖ حسب ذیل ہیں:

> "بہرصورت ہمیں اس رائے سے بالکل اختلاف ہے کہ عربی میں ایسے علوم موجود ہیں جن کی تعلیم ہمارے دماغوں میں روشنی، دلوں میں صفائی، خیالات میں پاکیزگی، ارادوں میں بلندی اور طبیعتوں میں استقلال پیدا کرسکے گی۔
>
> ہم جہاں تک سمجھتے ہیں عرب ہمیشہ ایک نہایت جاہل اور وحشی قوم رہے ہیں، شائستگی اور تہذیب سے ان کو بہت کم حصہ ملا ہے، البتہ ان کی زبان میں علوم وفنون کے کسی معتد بہ ذخیرہ کا موجود ہونا بعید از قیاس ہے۔" (صدقنا و آمنا)

ایسی حالت میں جبکہ رسول کا نواسہ تشنہ لب کربلا میں شہید کیا جائے، صحابہ کی داڑھیاں نوچی جائیں اور مسجد نبوی میں گھوڑے کی لید ڈالی جائے، علوم وفنون کی کیا خاک اشاعت و تدوین ہوسکتی ہے۔

زمانۂ جاہلیت کا کل نظم کا ذخیرہ عربوں کی خانہ جنگیوں اور
خون ریزیوں کے قصص یا اونٹ کی نسل اور گھوڑوں کی نادر الشانی کی
تعریف اور توصیف سے پر ہے، کسی قسم کے علمی مضامین کا اس میں
پتہ نہیں۔

پچھلے زمانے کے کلام میں سوائے عیش پرست خلفا اور ان
کے مداحین معشوقوں کی تعریف اور شراب و کباب کی توصیف کے
کیا رکھا ہے؟ ایسی گندہ ادب کا نظم کو پڑھنے سے بجز خراب اخلاق
کے کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ فن تاریخ میں عربوں نے بہت ترقی کی
تھی مگر وہ تاریخیں جو شائع ہو چکی ہیں اور حواشی کے اضافے کے ساتھ
یورپ کی زبانوں میں ترجمہ ہو گئی ہیں، ان کا مطالعہ اصل عربی
کتابوں سے بہت زیادہ مفید ہے۔"

(یہاں تک ریڈیکل صاحب کے تقریروں کا اقتباس تھا)

سب سے پہلے قابل لحاظ یہ امر ہے کہ احیاء علوم عربی کے مسئلہ پر ریڈیکل
صاحب کو اس پہلو سے بحث کرنے کی کوئی ضرورت بھی تھی یا نہیں؟

ہم ریڈیکل صاحب اور تمام مخالفین عربی سے پوچھتے ہیں کہ اگر تھوڑی دیر
کے لیے بفرض محال یہ تسلیم کر لیا جائے کہ عربی میں قابل قدر ذخیرہ علمی موجود ہے تو وہ
کیا عربی تعلیم کو جائز رکھیں گے؟ مسٹر ہاریسن نے عربی کے ساتھ ساتھ جدید سائنس
کی تعلیم کی اسکیم بھی پیش کی تھی، کیا مخالفین عربی نے اس اسکیم کی تائید کی؟ کیا سائنس
بھی عربی کی طرح قابل التفات نہیں ہے؟ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ یہ جدید گروہ علم کو
علم کے لیے پڑھتا ہے، کیا اگر انگلش تعلیم سرکاری ملازمت کا ذریعہ نہ ہو تو ایک شخص
بھی کسی کالج کے احاطہ میں نظر آئے گا؟ کیا کالج سے نکلنے کے بعد بھی انگریزی کے

فرماتے ہیں کہ "خلیفہ اول و دوم کے وقت تک قرآن مجید بھی مرتب نہیں ہوا تھا"!

ریڈ نکل صاحب کے استدلال کا منشا بنیاد یہ ہے کہ "عرب ایک وحشی قوم ہے، اس لیے ان کی زبان میں علمی ذخیرہ کا ہونا بعید از قیاس ہے"۔ لیکن اگر عرب کا وحشی ہونا تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے اس دعویٰ کو کچھ مدد نہیں پہنچتی، عربی زبان میں جن لوگوں نے علمی ذخیرے مہیا کیے وہ عجمی تھے، مثلاً فارابی، بوعلی سینا، رازی، غزالی، محقق طوسی، قطب الدین شیرازی وغیرہ، اور عجم کو غالباً ریڈ نکل صاحب بھی وحشی کا خطاب دینا پسند نہیں کرتے۔

پروفیسر رینان نے جو اسلام کے ساتھ تعصب رکھنے میں مشہور ہیں فرانس کی اکاڈمی میں ایک لکچر دیا تھا جس کا موضوع یہ تھا کہ "اسلام اور علم دونوں یکجا نہیں ہو سکتے"۔

اس لکچر میں جہاں مجبوراً اس کو مسلمانوں کی علمی اور فلسفی تحقیقات کا تذکرہ کرنا پڑا، اس نے یہ کہا "ہاں فلسفہ عربی زبان میں ہے لیکن عربوں میں نہیں ہے"۔

رینان نے اگرچہ اہل عرب کے فلسفہ دانی سے انکار کیا لیکن اس سے انکار نہ کر سکا کہ عربی زبان فلسفہ کا مخزن ہے۔ لیکن ریڈ نکل صاحب یہ بھی گوارا نہیں کر سکتے کہ عربی میں علوم و فنون کا ذخیرہ موجود ہو۔

"ریڈ نکل" صاحب فرماتے ہیں کہ "لٹریچر میں عربوں کے پاس نثر میں تو کوئی عمدہ ذخیرہ نہیں اور نظم کی یہ کیفیت ہے کہ زمانہ جاہلیت کی نظم اونٹ کی تعریف اور زمانہ اسلام کے ساتھ حسین معشوقوں کی توصیف پر محدود ہے"۔ یہ بالکل اسی قسم کی بات ہے کہ پرانے مولوی یورپ کے علوم و فنون کی نسبت کہتے ہیں کہ "یہ لوگ بجز اس کے لوہاروں اور بڑھئیوں کی طرح کچھ کلیں بنانیں یا مداریوں کی طرح کچھ چیزیں پھونک دیں، اور کیا جانتے ہیں"۔

افسوس!

تو کہتا تھا کہ "میں سب کو سلام کرتا ہوں بہ استثنا ہرم بن سنان کے" یعنی بادشاہ کو سلام کرنا بھی ایک قسم کی خوشامد ہے، جو عرب کے شاعر کو زیبا نہیں۔

افسوس ہے کہ ریڈیکل صاحب اور اکثر ان کے ہم فن عربی زبان نہیں جانتے، ورنہ ہم ان کو عربی زبان میں شاعری کے تمام انواع کے اپنے اعلیٰ درجے کے نمونے دکھاتے جس کی نظیر ان کو بہت مشکل سے مل سکتی۔ مناظر قدرت مثلاً سبزہ زار، کوہستان، دریا، جنگل، گرمی کی شدت، جاڑوں کی خنکی، ہوا، باراں وغیرہ یا جذبات انسانی مثلاً رنج و غم، غیظ و غضب، فخر و جوش، شجاعت و دلیری، ذوق و محبت وغیرہ کو جس خوبی سے عرب نے ادا کیا، ایشیا میں کون قوم اس کی مثال پیش کر سکتی ہے؟

اخلاق کے متعلق ہم دو چار مثالیں صرف ایک کتاب (حماسہ) سے سرسری طور پر انتخاب کر کے پیش کرتے ہیں۔ اگر ریڈیکل صاحب کے نزدیک یہ شاعری کا عمدہ نمونہ ہو تو ہم اس قسم کے اشعار کا دریا بہا دینے کو موجود ہیں۔(۱)

اذا ما اتت من صاحب لك زلة	فكن انت محتالا لزلته عذرا
وللكف عن شتم اللئيم تكرما	اضر له من شتمه حين يشتم
ان من الحلم ذلا انت عارفه	والحلم عن قدرة فضل من الكرم

---

(۱) چونکہ ہمارے دوست مسٹر ریڈیکل زبان عربی سے نابلد ہیں ہم ان کی آسانی کی غرض سے ان اشعار کا ترجمہ تحریر اور درج ذیل کیا جاتا ہے لیکن یہ کہہ دینا ہے کہ چونکہ ان اشعار میں محاورات کی خاص اور شاعرانہ نکات کی نزاکتوں کی طرف اشارہ ہے اس لیے کسی دوسری زبان میں لفظی ترجمہ غلط ہے۔

(۱) اگر تمہارے دوست سے کوئی غلطی ہو جائے تو تم خود اس کی طرف سے کوئی عذر گڑھ لینا چاہیے

(۲) ذلیل آدمی کے برا کہنے سے باز رہنا اس کو گالی دینے سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔

(۳) بعض موقع پر بردباری ذلت ہے لیکن قدرت کے ہوتے بردباری کرنا شرافت ہے۔

اس نقشہ سے واضح ہوا ہوگا کہ ایک دو کتابوں کے سوا باقی کا ترجمہ انگریزی میں نہیں ہوا بلکہ لاطینی وغیرہ میں ہوا ہے، ان سے متمتع ہونے کا طریقہ ریڈیکل صاحب کیا قرار دیتے ہیں؟ کیا وہ اس بات پر راضی ہیں کہ علی گڑھ کالج میں لاطینی اور فرنچ وغیرہ کی تعلیم کی شاخ کھولی جائے؟ اگر ان کا ایسا ارادہ ہو تو ہم خوشی سے عربی تعلیم کی تحریک کو واپس لیتے ہیں۔

لیکن اصلی سوال یہ ہے کہ کیا مذکورہ بالا کتابوں کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عربی تاریخ کا سرمایہ یورپ کی زبانوں میں منتقل ہو گیا ہے، عربی کی نایاب اور غیر مطبوعہ تاریخیں تو ایک طرف مشہور متداول کتابوں کا بھی ترجمہ نہیں ہوا، ابن خلدون، ابن اثیر، طبری کو بچہ بچہ جانتا ہے، ان کا ترجمہ کس زبان میں ہوا؟ اور کیا ان کتابوں کے ترجمے کے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یورپین زبانوں میں عربی کا سرمایہ منتقل ہو گیا ہے، کشف الظنون میں جس قدر عربی تاریخوں کے نام مذکور ہیں ان کی تعداد تیرہ سو ہے۔ کیا اس خزانہ میں سے پانچ سات تاریخی کتابوں کے ترجمہ کی بنا پر عربی سے بے نیازی کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے؟

عربی تاریخ کا جو اصلی خزانہ ہے یعنی محدثین کی تصنیفات، اس تک ابھی یورپ کی نگاہ بھی نہیں پہنچی، "تا بہ ترجمہ چہ رسد" رجال و تراجم کی سیکڑوں ہزاروں کتابوں میں سے کس کتاب کا یورپین زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے؟

یورپ میں عربی تاریخ کی کتابیں نہایت کثرت سے شائع ہوئی ہیں لیکن ترجمہ نہیں بلکہ یورپ نے ان کو اصل زبان ہی میں پڑھنا پسند کیا اور ریڈیکل صاحب کی اس رائے پر عمل نہیں کیا کہ ترجموں کے ذریعہ سے ان پر نظر ڈالنی چاہیے

ریڈیکل صاحب فرماتے ہیں کہ "عربی زبان میں ایسے معلومات نہیں جن سے ارادوں میں بلندی اور طبیعت میں استقلال پیدا ہو۔"

آزادی اور استقلال زیادہ تر تاریخی معلومات کا خاصہ ہے، جب ہم کسی

ملک کی تاریخ میں آزادی اور استقلال کی مثالیں پڑھتے ہیں تو طبیعت میں خود بخود ان جذبات کی تحریک ہوتی ہے، عرب کی تاریخ اس قسم کی مثالوں سے لبریز ہے، آزادی عرب کا مایۂ خمیر ہے، بلند خیالی، دلیری، آزادی، خودسندی کی جو مثالیں تاریخ عرب کے ہر صفحہ میں مخفی ہیں آج بھی یورپ اس قسم کے واقعات پیش نہیں کر سکتا۔

آزادی کی اس سے بڑھ کر کیا مثال ہوگی کہ صحابہ جس قدر آنحضرت ﷺ کا ادب و احترام کرتے تھے، اس سے زیادہ امکان میں نہ تھا، تاہم ہر موقع پر آپ آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے کہ آج ہم کو ان کے بیان کرنے میں تامل ہوتا ہے، ہند (امیر معاویہ کی ماں) جب اسلام قبول کرنے کے لیے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ نے اس سے بیعت لینے کے وقت یہ فرمایا کہ "عہد کرو کہ اپنی اولاد کو قتل نہ کروگی" تو اس نے یہ الفاظ کہے "یا محمد ربیناهم صغیراً وقتلتهم کبیراً یوم بدر فانت وهم اعلم" "اے محمد! ہم نے تو اپنے بچوں کو پال پوس کر بڑا کیا تھا اور تم نے بدر کی لڑائی میں ان کو قتل کر دیا تو تم اور وہ سمجھ لو۔"

حضرت عمرؓ کا رعب و جلال دنیا کو معلوم ہے، لیکن ایک عام عرب سر دربار ان سے اس طرح خطاب کرتا تھا کہ کوئی شخص اپنے برابر والے کے ساتھ بھی نہیں کر سکتا، خالد سیف اللہ نے روم کی غارت میں فخریہ اظہار کیا تھا کہ ہم نے جس کو بادشاہ بنا رکھا ہے (یعنی حضرت عمر فاروقؓ) وہ کسی بات میں ہم سے ترجیح کا دعویٰ نہیں کر سکتا، وہ اگر ظالم ہو لے تو ہم کو اس کو ٹوک دیں، چوری کرے تو اس کے ہاتھ کاٹ ڈالیں، خلاف انصاف کرے تو معزول کر دیں۔

امیر معاویہؓ کے حکم سے جب ان کے عامل نے مدینہ منورہ کی مسجد میں یزید کی خلافت کا اعلان کیا اور یہ کہا کہ سنة ابی بكر و عمرؓ یعنی جانشین مقرر کرنا ابوبکرؓ و عمرؓ کا طریقہ ہے تو وہیں ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا کہ کذبت لا بل سنة کسری و قیصر تو جھوٹ بولتا ہے، یہ کسریٰ اور قیصر کا طریقہ ہے۔

پھر کو قرآن کی بھی ضرورت نہیں، یا یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ قرآن کا سمجھنا بغیر عربی کی اعلیٰ تعلیم کے ممکن نہیں۔

بہرحال عربی کی مخالفت جس طریقہ سے کی گئی، وہ جس حد تک بھی پہنچی ہو لیکن اس کی نسبت یہ مصرع صادق آتا ہے۔

سمجھے تو ہیں غلطی کی ولیکن بری طرح

عربی کی تحقیر نے یہ ثابت کر دیا کہ قوم واقعی ذلت کے کس درجہ پر پہنچ گئی ہے، کیونکہ کوئی قوم اس وقت تک ذلیل نہیں ہوتی، جب تک وہ خود اپنے آپ کو ذلیل نہ سمجھے اور یہ درجہ اب قوم نے حاصل کر لیا۔

(دکن ریویو مئی ۱۹۰۳ء)